جلد ۹۱ اپریل ۱۹۷۹ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۱ | اپریل ۱۹۷۹ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

راہِ ہدایت کیا ہے؟ اچھی اور بُری زندگی کا معیار کیا ہے؟ خدا پرستانہ زندگی سے کیا نتیجہ معاشرے کو ملتا ہے؟ اور ایک صحت مند، تعمیر پسند مسلم قیادت کی علامت کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ سوالات بڑی تفصیلی بحثیں چاہتے ہیں، اور قرآن کی آیات اور سنّت کی روایات ساری کی ساری انہی کا مکمل جواب فراہم کرتی ہے۔

مگر قرآن میں جہاں تفصیل و تشریح کے کمالات ہیں، وہاں ایجاز و اجمال کے بھی اعجاز موجود ہیں۔ ایک ذرا سے سوال پر بھرپور بحث و استدلال کی مثالیں بھی ہیں، اور صد ہزار سوالات کو مرتکز کر کے جواب میں کہیں ایک نقطہ رکھ دیا گیا ہے جس پر لگاہیں جمانے سے نکتہ ہائے ایمان و حکمت کے موتیوں سے دامنِ فکر و نظر بھر جاتا ہے۔

اُوپر کے سوالات کے جو تفصیلی جواب قرآن نے دیے ہیں، اُن کو سکیڑ سمیٹ کر چند لفظوں میں بھی متعدد مقامات پر، مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ایسے ہی ایک مقام کی طرف ہم متوجہ ہو رہے ہیں۔

سورۃ النحل کا اصل مضمون یقیناً شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات ہے۔ کچھ مباحث اس مضمون کے متعلق ہیں۔ پھر کلام کے بعض حصّوں کا تعلق مکّے کے آخری دَور (قبل ہجرت) کے مخصوص احوال سے ہے۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ توحید پر مبنی اور اس سے تعلق رکھنے والی بعض دوسری اہم باتیں بھی اس سورہ میں شامل ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ خدائے واحد کی ربوبیت و الوہیت کی ایک شانِ خاص یعنی ہدایت رسانی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہدایت کی گفتگو پوری سورہ کے مباحث کی ڈوریوں کے ساتھ گندھی ہوئی چلتی ہے۔ اس کا سررشتہ آیت ۲ سے ملتا ہے جس میں ہدایت کے لیے وحی بھیجنے کا ذکر ہے۔ پھر

آیت ۹ میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت بہم پہنچانا یا سیدھا راستہ دکھانا اللہ کے ذمے ہے۔ بیچ میں جگہ جگہ یہ مضمون جھلکیاں دکھاتا ہوا آیت ۸۹ میں پورے اُبھار پہ آجاتا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔"

پھر یہ مضمون آیت ۹۷ میں چاند کی طرح چمک اٹھتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ،

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا (عملِ صالح کا اصولی خاکہ اُوپر دیا جا چکا ہے) خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اُسے ہم دُنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔"

یہ اصولی بات دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہے، مگر جس زور کے ساتھ اور جس انداز میں اس مقام پر ہے، اس کے رُو سے مخاطب کو فوری تاثر یہ ملتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کا دار و مدار اعمالِ صالحہ پر ہے، یا آیت کی ترتیبِ کلمات کے مطابق کلیہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص (یا معاشرہ) جو بحالتِ ایمان اعمالِ صالحہ پر کاربند ہوگا۔ اُسے "حیاتِ طیبہ" کی نعمتِ گراں بہا حاصل ہوگی۔ میرے نزدیک یہ آیت سورہ النحل کی عمارت کا منارہ ہے۔

اب ان دونوں آیات کی تھوڑی سی تشریح بھی سامنے رکھ لیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۔۔ الخ کے متعلق ابن کثیر کے ہاں ایک روایت کا حوالہ ہے جس کی رُو سے اکثم بن صیفی کے بھیجے ہوئے دو قاصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اکثم نے آپؐ سے دریافت کیا ہے کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کیا ہیں؟ جواباً حضورؐ نے فرمایا، "فاما من انا؟ فانا محمد بن عبد اللّٰہ - واما ما انا؟ فانا عبد اللّٰہ و رسولہ"۔ یعنی یہ سوال کہ میں کون ہوں تو میں محمدؐ بن عبد اللہ ہوں، اور دوسرا سوال کہ میں کیا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے متذکرہ آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ...... الخ۔ قاصدوں نے اکثم کو پیغام پہنچایا۔ سن کر اس نے کہا میرا تاثر یہ ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور پستیٔ اخلاق سے روکتا ہے۔ پس تم لوگ اس کام (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک میں) پیش رَو بنو، نہ کہ صفِ آخر کے لوگ۔ اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی نگاہ میں کتنی بڑی اہمیت تھی اس آیت کی، جسے آپ نے بہ حیثیت اپنے پیغامِ رسالت

کے بیان فرمایا۔

اس آیت پر تفہیم القرآن کا تشریحی نوٹ ملاحظہ ہو:۔

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

"پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اُردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے، نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افرادِ معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوقِ شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل عدل کے خلاف ہے مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات، اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کمتر درجے کی خدمت کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری سے ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کم پر راضی ہو جانا۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر

کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اُسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی، مگر محبت اور شکرگزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیرخواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلۂ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت معین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں اُن کا شریکِ حال ہو اور جائز حدود کے اندر اُن کا حامی و مددگار بنے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہے اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصرِ ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر اُن کے حقوق عاید ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اوّلین حقدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں۔ پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں۔ اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا ——— اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (UNIT) اس طرح

اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو گی"۔

آیت کے دوسرے حصے کے متعلق بھی ذیل کی توضیح بصیرت افروز ہے:

"اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو، اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے، مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عملِ قومِ لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا، اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں۔ اور تمام شرائعِ الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے"۔

تین مثبت اصولوں کے قیام اور تین منفی و تخریبی عوامل کے سدباب کا یہ فرمان دراصل اسلام کا مختصر منشور ہے۔ اس منشور کی اساس پر جو شخص یا جو معاشرہ اپنی زندگی استوار کرے گا، وہی ان نتائج حسنہ کو پا سکتا ہے جن کی بشارت دینے والا اسلام ہے۔

اسی منشورِ فلاح کو پس منظر میں رکھ کر قرآنی آیت " فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً "کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کے امر کردہ اور نہی کردہ امور کو ملحوظ رکھ کر بحالتِ ایمان عملِ صالح کریں گے وہ اُن کو پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی سعادت دے گا۔

یہاں "حیٰوۃ طیبہ" سے مراد عیش و عشرت کی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایسی زندگی جو بدباطنی سے پاک ہو اور جسے معصیت کے زخم نہ آئے ہوں، ظلم اور ہوسناکی نے ایسے کانٹے نہ بو دیے ہوں کہ آدمی ہزار تنعم کے باوجود سکون نہ پا سکے، وہ اپنی نگاہوں میں مجرم بنا رہے اور ضمیر کی عدالت میں وہ حزن و ملال

کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہر روز .... اپنے اعمال بد کا بوجھ اُٹھائے پیش ہوتا ہو اور خداوند تعالیٰ کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتا ہو۔

حیاتِ طیبہ جس کی بشارت ایمان و عملِ صالح سے آراستہ لوگوں کو دی جا رہی ہے، اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے شاید تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا خاصا ممد ہو گا۔

سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۲۴ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا .... الخ

اور جو میرے ذکر (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دُنیا میں تنگ زندگی ہو گی۔

اس آیت کی اصطلاح "معیشۃً ضنکًا" پر تفہیم القرآن کا مختصر توضیحی نوٹ یہ ہے:

"دُنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اُسے تنگ دستی لاحق ہو گی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اُسے چین نصیب نہ ہو گا۔ کروڑپتی بھی ہو گا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرماں روا بھی ہو گا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دُنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی، جو اُسے کبھی امن و اطمینان اور سچی مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔"[1]

اب آپ "حیوٰۃً طیبۃً" کے بالمقابل "معیشۃً ضنکًا" کو رکھ کر دونوں کا مفہوم بآسانی متعین کر سکتے ہیں۔

---

[1] اس وقت کی پوری ماڈرن دُنیا میں آپ ایک ایک شخص کو "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کا عبرت ناک نمونہ دیکھیں گے۔ ہر طرف خوف، ہر طرف نفرت، ہر طرف تشدد، ہر کوئی بے ہمدم و محرم، نہ دوسروں پر اعتماد، نہ اپنے آپ پر اعتماد، ہر کوئی بے سکون! کوئی حقوق کی لڑائی لڑ رہا ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ کوئی چھاپہ مار بن رہا ہے، کوئی ہیپی ازم اختیار کر رہا ہے، کوئی گمٹیا نشوں میں سکون و راحت تلاش کر رہا ہے۔ کوئی خودکشی کو واحد حل سمجھتا ہے۔ اتنی دولت، اتنے فلسفے، اتنی آسائشیں، اتنی تفریحات ــــــ اور پھر یہ عالمگیر اضطراب! (ف۔ ج)

فی الحقیقت انسانی بے چینیوں اور اضطراب کا بنیادی سبب حالتِ خوف کا موجود رہنا ہے۔ خوف جس کی کئی اقسام ہیں، ایک آسیب کی طرح انسان کے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُسے امن و سکون سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن نے اسی حالت کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت اور اس کے مقابلے میں حالتِ امن (معاشرتی اور ذہنی) کو سب سے بڑی نعمت کی حیثیت دیتے ہوئے اہلِ ایمان کو عملِ صالح کے نتیجے میں حاصل ہونے والی خلافت کا ماحصل یہ بتایا ہے کہ،

وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ (النور - ۵۵)

اور (اللہ تعالیٰ) اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن کی حالت) سے بدل دے گا۔[1]

اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط بات نہ ہوگی کہ پہلے ہم جو بات اس شکل میں بیان کر چکے ہیں کہ اسلام انسان کو معیشۃً ضنکاً سے نجات دلا کر اُسے حیاتِ طیبہ کے مقام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہی بات یہاں اور بھی زیادہ ایجاز سے بیان کی گئی ہے۔ یعنی حالتِ خوف کو حالتِ امن سے بدل دینا مقصودِ دین ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں۔

اب گویا ایک مسلم معاشرے، اس کی حکومت اور اس کی قیادت کے لیے ذمہ داری کا سیدھا راستہ واضح اور متعین ہو گیا۔ اس کی تمام تر مساعی کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خدا کی ہدایت کے مطابق تعلیمی، معاشی اور قانونی ذرائع سے کام لے کر ایک ایک فرد کو معیشۃً ضنکاً کے عذاب سے نکالے اور حیوٰۃ طیبہ کے مقام تک پہنچائے۔ (باقی بر صفحہ ۴۸)

---

[1] قرآن میں "خوف" کے ساتھ دوسرا لفظ "حزن" بھی متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ - ۲۶۲) لیکن حزن دراصل ان چیزوں کے واقع ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے جن کا خوف پیشتر سے لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا حزن بھی خوف کے تحت آ جائے گا۔ چند مقامات پر خوف کے ساتھ لفظ جوع بھی مذکور ہے۔ اس صورت میں بھی معاملہ حزن ہی کا سا ہے، یعنی محرومیٔ رزق جن وجوہ سے نمودار اور مسلط ہوتی ہے، انسان پہلے سے اُن کے خوف کی زد میں ہوتا ہے پس جامع تصور خوف ہی کا ہے، چاہے وہ قتل کا خوف ہو؛ ذلت کا ہو، محرومیٔ حق کا ہو یا تنگدستی کا۔ (ن - ص)

پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ریڈیو انٹرویو)

۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو رات ۸ بجے ریڈیو پاکستان کے قومی پروگرام میں تمام اسٹیشنوں سے یہ انٹرویو نشر ہوا، جو ریڈیو پاکستان کے ریجنل ڈائریکٹر جناب سلیم گیلانی اور پروڈیوسر ناصر قریشی صاحب نے حاصل کیا تھا۔ (ادارہ)

نمائندہ ریڈیو پاکستان ریڈیو پاکستان کا نمائندہ سلیم گیلانی آپ سے مخاطب ہے میں اس وقت حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے کتب خانے سے بول رہا ہوں جہاں مولانا مودودی اپنی ہزاروں کتابوں کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ مولانا مودودی اس وقت تمام دنیا میں دین اسلام، اسلامی فقہ اور کاوشِ اسلام پر ایک مستند عالمِ دین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ ریڈیو پاکستان اور اس کے سامعین کی خوش قسمتی ہے اور میں مولانا کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے باوجود اپنی علالت کے ہمیں پاکستان میں نافذ ہونے والے اسلامی قوانین کے بارے میں گفتگو کا موقع عنایت فرمایا۔

جناب والا پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے آغاز کے ضمن میں چند سوالات پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اور اس مکمل یقین کے ساتھ کہ آپ کے ارشادات سے نظامِ اسلام کے بارے میں جو وضاحتیں ہوں گی وہ سامعین کے لیے نہایت مفید معلومات اور بہترین رہنمائی کا باعث بنیں گی۔ مولانا یہ ارشاد فرمایئے کہ عید میلاد النبیؐ کے مبارک موقع پر صدر پاکستان نے جن اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا ہے، آپ کے نزدیک اُن سے ہمارے معاشرے میں فوری طور پر کون سے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟

جواب | فوری طور پر تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ لوگ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ اب ہمارے ملک میں اسلامی احکام بتدریج نافذ ہو رہے ہیں۔ اس طرح سے لوگوں میں ایک ذہنی آمادگی پیدا ہوگی۔ اس طرح کے قوانین یا معاشرے کو درست کرنے والی تدابیر سے فوری نتائج برآمد نہیں ہوا کرتے بلکہ جب اُن پر عمل درآمد ہونے لگتا ہے تب ہی اُن کے نتائج برآمد ہوتے ہیں البتہ اعلان لوگوں میں ایک ذہنی آمادگی پیدا کر دیتا ہے۔

نمائندہ ریڈیو | مولانا! دنیا آج کل بہت سمٹ گئی ہے، ملک میں کوئی قانون یا کوئی بڑا واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی پڑتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اسلامی قوانین کے نفاذ سے پاکستان اور بنی نوع انسان پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ فوری اور دُور رس نتائج؟

جواب | فوری طور پر دُنیائے اسلام میں تو یہ اثر ہوا ہے کہ پاکستان جس نام سے قائم کیا گیا تھا۔ اب اس دین کے نفاذ کا کام یہاں کچھ شروع ہو رہا ہے اور اس وجہ سے تمام دُنیا کے مسلمان اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ کریں گے۔ غیر مسلم دُنیا ویسے ہی اسلام سے بدظن بھی ہے اور اس کو ایک ناقابلِ عمل قانون سمجھتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ غالباً یہی محسوس کریں گے کہ پاکستان میں ناقابلِ عمل اور فرسودہ قانون نافذ ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ہمارے متعلق کوئی کیا خیال کرتا ہے۔ ہم جس چیز پر ایمان لائے ہیں اس پر ہمیں لازماً عمل کرنا ہے اس سے چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔

نمائندہ ریڈیو | حضرت مولانا محترم! فقہ کے تمام مکاتب فکر اسلامی قانون پر متفق ہیں۔ لیکن اس سے اخذ ہونے والی دفعات پر کیا سب کا اتفاق ممکن ہے؟

جواب | یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل اس غرض کے لیے قائم کی گئی ہے کہ جو قوانین بھی نافذ کیے جائیں پہلے وہ اس کونسل کے اندر مرتب کیے جائیں اور اس سے پاس ہونے کے بعد پھر ان کو نافذ کیا جائے۔ اس کونسل میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہیں۔ اور جو چیزیں بھی اس وقت سامنے آ رہی ہیں وہ یقیناً کونسل کی طرف سے متفقہ طور پر آ رہی ہیں۔ اس لیے یہ سوال کوئی پیچیدگی پیدا نہیں کرتا۔

نمائندہ ریڈیو | مولانا! زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کے بعد دوسرے ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، سیلز ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی اور ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ کا کوئی جواز رہ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب | اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ زکوٰۃ اور عشر تو صرف معاشرے کے غریب اور پسماندہ لوگوں کی مدد کے لیے ہیں، حکومت کا کام چلانے کے لیے نہیں۔ حکومت کا کام چلانے کے لیے دوسرے

ٹیکس عاید کیے جائیں گے۔ البتہ چونکہ اب زکوٰۃ اور عشر کا حکم نافذ ہو رہا ہے اس لیے سارے ٹیکسیشن کے نظام پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی۔ تاکہ اس کے اندر زکوٰۃ اور عشر کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ زکوٰۃ اور عشر سے ہی حکومت کا پورے کا پورا نظام چلایا جائے گا، صحیح بات نہیں ہے۔ دوسرے ٹیکس لگائے جائیں گے اور لگانا ناگزیر ہے۔

نمائندۂ ریڈیو | مولانا! ایک سوال فوری طور پر ذہن میں آ رہا ہے کہ آیا اسلام کے اوّلین دَور میں حکومتی نظام چلانے کے لیے جو مدّات تھیں، وہی اس دَور میں بھی رائج ہو سکتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی فرما دیجیے کہ زکوٰۃ کے مصارف کی جو آٹھ مدّات ہیں۔ اُن میں فی سبیل اللہ کی جو مد ہے، اس کی وضاحت کیا ہے۔ یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں انہوں نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے تالیفِ قلب کی مد حذف کر دی تھی۔ کیا اب بھی ایسا ہو سکتا ہے؟

جواب | آپ کے اس سوال کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے کا جواب تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں حکومت کا نظام اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنا اِس وقت ہے اور نہ اتنا ہمہ گیر تھا جتنا موجودہ زمانے میں ہے۔ اِسی وجہ سے اُس زمانے میں غیر مسلموں سے جزیہ اور اُن کی زمینوں سے جو خراج وصول کیا جاتا تھا، اور اس کے علاوہ جو اموالِ غنائم جمع ہوتے تھے، یہ حکومت کا نظام چلانے کے لیے کافی تھے۔ اُس زمانے میں بڑے بڑے محکمے نہیں تھے، بڑے بڑے سرکاری عہدہ دار نہیں تھے، بڑی بڑی تنخواہیں لینے والے نہیں تھے، اِس وجہ سے اُس وقت زیادہ ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اُس زمانے میں حکومت کے نظام کے لیے جس طرح کے مالیات سے کام لیا جاتا تھا۔ صرف انہی مالیات پر اکتفا کیا جائے، بلکہ دوسرے ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کی مد ایک گروہ کے نزدیک رفاہِ عام کے لئے استعمال ہو سکتی ہے اور ایک گروہ کے نزدیک وہ صرف جہاد کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔ یعنی جو شخص جہاد میں جانا چاہے۔ اس کو مالی فنڈ کی ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد میں سے اس کو دیا جا سکتا ہے لیکن اس پر اتفاق نہیں۔ نظریاتی کونسل میں جب یہ مسئلہ سامنے آئے گا تو وہ باہم مباحثہ کر کے کسی ایک چیز پر اتفاق کریں گے میں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ اس میں دو رائیں موجود ہیں۔

آخری چیز جو آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں پوچھی ہے اس کے متعلق یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ

علیہ وسلم کے زمانے میں بعض ایسے لوگوں کو جو اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن پوری طرح ان میں ثابت قدمی پیدا نہیں ہوئی تھی ان پر تالیف قلب کی مد سے زکوٰۃ دی جاتی تھی۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی لوگ مطالبہ لے کر آئے تو حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا "کہ اب ہمیں آپ کی تالیفِ قلب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری حکومت اب اتنی مضبوط ہو چکی ہے اگر آپ تالیفِ قلب کے بغیر اسلام کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہمیں اس کی پروا نہیں ہمارا کام اب آپ کی تالیفِ قلب اور مدد کے بغیر چل رہا ہے اور چلے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے ضمن میں تالیفِ قلب کی جو مد رکھی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گئی ہو اس بارے میں بھی میرا خیال یہ ہے کہ نظریاتی کونسل میں اس مسئلہ پر بحث ہوگی اور وہ اس کو طے کریں گے کہ آیا تالیفِ قلب کی مد ساقط ہے یا نہیں۔

نمائندہ ریڈیو | مولانا! تالیفِ قلب کی مد کی ذرا وضاحت فرمائیں گے؟

جواب | تالیفِ قلب کی وضاحت یہ ہے ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسلام کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں اور ان کو کچھ روپیہ دے کر اس مخالفت سے باز رکھنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ایک آدمی نیا نیا مسلمان ہوا ہے چونکہ اس کا معاشرہ تبدیل ہوا ہے اور وہ دوسرے معاشرے میں آیا ہے تو اس کی دل دہی کے لئے کچھ مالی مدد دی جاتی ہے تاکہ وہ نئے دین پر استقامت کے ساتھ چلنا شروع ہو جائے۔ تیسرا اگر وہ ایسا ہوتا ہے جس میں کسی حد تک منافقت کی بو باقی ہو تو اس کو منافقت سے باز رکھنے کے لئے اور اس کو ایمان پر ثابت قدم رکھنے کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے اسی لئے قرآن مجید میں تالیفِ قلب کی مد رکھی گئی ہے۔

نمائندہ ریڈیو | مولانا محترم! یہ ارشاد فرمائیے کہ قذف کا اطلاق جنسی بے راہروی تک ہی محدود ہے یا معاشرے میں ہر قسم کی کی جانے والی بہتان طرازی بھی اس کے دائرے میں آتی ہے۔

جواب | قذف جس کی یہ حد مقرر کی گئی ہے وہ صرف کسی شخص پر زنا کی تہمت لگانے سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی اگر اور کسی قسم کی بہتان طرازی کی جائے تو عام قانونِ تعزیرات کے تحت اس کو سزا دی جائے گی لیکن قذف کی یہ حد اس پر عائد نہیں کی جائے گی۔ یہ حد صرف بہتانِ زنا پر ہے۔

نمائندہ ریڈیو | جناب والا! استفسار یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے تحت جو بھی تعزیر ہو گی وہ یقیناً معتبر شہادت کے بغیر نہیں ہو گی۔ کیا ہمارے آج کے معاشرے میں ایسی شہادتیں مل سکتی ہیں جو اسلامی شریعت کے اعتبار سے معتبر تسلیم کی جا سکیں۔

جواب اس میں شک نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک مدتِ دراز سے بہت بگاڑ پیدا ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہمارے ہاں جھوٹی گواہی دینے والے کثرت سے موجود ہیں۔ پولیس بھی ان کو تیار رکھتی ہے۔ اور ویسے بھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عدالت میں جھوٹ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم ایک طرف اسلامی قوانین کو نافذ کریں اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔ اب اگر اس معاملے میں تم نے بدنیتی سے کام لیا اور جھوٹی شہادتیں پیش کیں تو دنیا میں بھی سخت سزا دی جائے گی اور آخرت میں بھی اس کی سزا بہت سخت ہے۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ "شرک کے بعد دوسرا بڑا گناہ جھوٹی شہادت دینا ہے" اس چیز کو اگر بڑے پیمانے پر عوام کے ذہن نشین کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ اس آسانی سے پھر جھوٹی شہادتیں پیش نہیں کی جا سکیں گی جس آسانی سے پہلے کی جا سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے لئے بالکل ضروری ہے کہ پولیس کی تنظیم نو کی جائے، اس کی اصلاح کی جائے اور عوام الناس کی اصلاح کے لئے ریڈیو کو بڑے پیمانے پر کام کرنا چاہیئے کیونکہ خصوصاً ریڈیو ایک ایسی چیز ہے جسے کھیت میں ہل چلانے والا کسان بھی سنتا ہے مگر اخبار یا کسی اور چیز کے ذریعے سے ان تک آواز آسانی سے نہیں پہنچائی جا سکتی۔ اس لئے میں ریڈیو پاکستان کے ذمہ داران سے گزارش کروں گا کہ آپ ریڈیو کو اسلام کے لئے بڑے پیمانے پر استعمال کریں۔

نمائندہ ریڈیو شہادت کے لئے معتبر ہونے کی جو شرط ہے اس کی وضاحت کیا ہے یعنی کس شہادت کو معتبر تسلیم کیا جائے گا۔ صرف سچ بولنے والے کو، یا اس میں اس کے کردار کو بھی اسلام نے متعیّن کیا ہے ؟

جواب شہادت کے لئے اسلام میں جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے اسکا منشا یہ ہے کہ شاہدِ عادل ہو۔ شاہدِ عادل سے مراد ایسا آدمی ہے کہ جو انصاف کے سامنے شہادت دے، جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولے، کسی حقیقی بات کو چھپائے نہیں اور کسی غلط بات کو بیان نہ کرے۔ شہادت لینے سے پہلے بھی اس شخص کے بارے میں معلوم کیا جائیگا کہ اس کا کردار کیا رہا ہے۔ شہادت کے دوران میں بھی اس کے اندازِ بیان سے بھی جج اندازہ لگائیں گے کہ یہ آدمی سچ بول رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔ جرح کے ذریعہ سے بھی آدمی کا سچ یا جھوٹ کھلے گا۔ اس طرح سے توقع کی جا سکتی ہے کہ اسلامی حدود کے نفاذ میں معتبر شہادتیں فراہم ہو سکیں گی۔

نمائندہ ریڈیو جب اسلامی قوانین ہمارے ملک میں کمل طور پر نافذ ہو جائیں گے تو ہمارے ملک میں

وکالت کے پیشے کا مستقبل کیا ہو گا؟

جواب | وکالت کا رنگ بدل جائے گا، وکالت کا پیشہ ختم نہیں ہو گا۔ مقصد یہ ہے کہ وکیل کی حیثیت ایک طرح سے مفتی کی سی ہو جائے گی۔ کیونکہ وکیل کا اصل مقام یہ ہے کہ وہ عدالت کو بتائے کہ قانون کیا ہے۔ یہی کام قدیم زمانے میں ہمارے ہاں کے مفتی کیا کرتے تھے۔ عدالت میں جو مقدمات پیش ہوتے تھے، اُن کے متعلق مفتیوں کے فتوے آتے تھے، جو یہ بتاتے تھے کہ اس مسئلے میں قانون کیا کہتا ہے۔ یہی کام آئندہ وکلاء کو کرنا ہو گا۔ یعنی صرف وکلا کے طریقۂ وکالت میں تبدیلی ہو گی اور وکالت بذاتِ خود باقی رہے گی۔

نمائندۂ ریڈیو | مولانا کیا جھوٹی شہادت پیش کرنے والے پر کوئی تعزیر ہے۔

جواب | جی ہاں! اگر ثابت ہو جائے کہ ایک شخص نے جھوٹی شہادت دی ہے تو اُس کو اسلامی حکومت میں سزا دی جائے گی۔ اور اگر حدود اللہ کے معاملے میں جھوٹی شہادت دی ہے تو اُس کو سخت ترین سزا دی جائے گی۔ اس بارے میں حکومت قانون بنا سکتی ہے۔ یہ تعزیرات میں آتا ہے۔ حدود میں نہیں آتا۔ اس لیے حکومت کو ایسا قانون بنانا چاہیے کہ حدودِ شرعیہ کے معاملے میں جو شخص جھوٹ بولے اُسے نہایت شدید سزا دی جائے تاکہ لوگ یہ جرأت نہ کر سکیں کہ وہ عدالت میں جا کر جھوٹی شہادت دیں۔

نمائندہ ریڈیو | زکوٰۃ اور عُشر کے سلسلے میں جو اصطلاحات اموالِ باطنہ اور اموالِ ظاہرہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اُن کی وضاحت فرمائیے۔

جواب | اموالِ ظاہرہ سے مراد وہ اموال ہیں جو ظاہر میں نمایاں ہیں، جیسے ایک شخص کا دکان میں مال رکھا ہے۔ یا ایک کارخانے میں تیار شدہ مال پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح بینک میں اُس کا مال جمع ہے۔ یہ سب اموالِ ظاہرہ ہیں۔ اسی طرح کھیت موجود ہیں، اُن کی پیداوار ظاہر ہے۔ اموال باطنہ وہ ہیں جو آدمی گھر میں رکھے۔ خواہ اس کی بیوی کا زیور ہو یا بیٹیوں کا زیور یا اُس نے گھر میں کوئی نقدی جمع کر رکھی ہو، یہ سب اموالِ باطنہ ہیں۔ یہ ہے نمایاں فرق ان دونوں میں۔ باطنہ سے مراد وہ چیز جو عام نگاہوں سے چھپی ہوئی ہو۔ اور ظاہرہ سے مراد وہ چیز یا اموال جو عام نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، لاہور)

تعزیراتِ اسلام

مولانا بشیر احمد صاحب قاضی - باغ - آزاد کشمیر

(۱۷)

ذمی کی دیت | **تشریح ۴**

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ذمی اور مستامن کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہے (یعنی دیتِ کاملہ کا ثلث) اور مجوسی کی آٹھ سو درہم ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک چھ ہزار درہم ہے یعنی مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔[۱] اور یہی مذہب امام احمدؒ کا بھی ہے۔[۲]

امام شافعیؒ اپنے موقف پر حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس میں یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم مذکور ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو بھی ذکر کرتے ہیں اور اس میں مجوسی کی آٹھ سو درہم دیت مذکور ہے۔ علاوہ ازیں وہ عقلی دلیل بھی دیتے ہیں کہ جب عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے تو کفر جو انوثت سے زیادہ کمزور چیز ہے، اس کی وجہ سے کافر کی دیت بدرجۂ اولیٰ کم ہونی چاہیے۔[۳] امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی دلیل عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی

---

[۱] ہدایۃ جلد ۴ ص ۵۰۶ و احکام القرآن جلد ۲ ص ۲۳۸

[۲] المغنی جلد ۹ ص ۵۲۷

[۳] البدائع جلد ۷ ص ۲۵۴ و المغنی جلد ۹ ص ۵۲۸

روایت ہے یعنی یہ کہ " دِيَةُ الْمُعَاهِدِ نصف دِيَةِ الْمُسْلِمِ " یعنی معاہدہ کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہے۔ یہ روایت دوسرے الفاظ سے بھی منقول ہے۔ مثلاً عقل الکافر نصف دِيَةِ عَقْلِ الْمُسْلِمِ"[۱] یعنی اہل کتاب کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہے۔

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ حدیث عبادہ کو اہل سنن نے بیان نہیں کیا بظاہر یہ روایت صحیح نہیں ہے[۲]
اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بھی استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا اپنا عمل اس کے مطابق نہیں ہے جیسا کہ آگے مذکور ہے۔

امام ابو حنیفہ رح کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قتلِ مومن کے بارے میں فرمایا " دِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ " (یعنی دیت مقتول کے ورثاء کی دی جائے گی) اس کے بعد فرمایا۔ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ" اس حکم میں قتلِ مومن کی دیت کے ذکر کے بعد معاہد کی دیت کا ذکر کیا گیا ہے اور دونوں جگہ الفاظ ایک ہی ہیں یعنی " دِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ" اس میں معاہد کی دیت کی کوئی تفصیل نہیں ہے جس سے ظاہر یہی ہے کہ معاہد کی دیت وہی ہے جو پیچھے مومن کی بیان کی گئی ہے[۳]۔

۲۔ حدیث میں آتا ہے کہ " دیۃ کل ذی عہد فی عہدہ الف دینار " یعنی معاہد کی دیت جب تک وہ عہد کے اندر ہے ایک ہزار دینار ہے۔" اور یہی مسلمان کی دیت ہے۔

۳۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر کرتے ہیں[۴]
انہی کی دوسری سند اس طرح ہے کہ ایک مرد نے ایک ذمی شخص کو قتل کر دیا تھا۔ جس کا مقدمہ

---

[۱] البدائع جلد ۷ ص ۲۵۴ والمغنی جلد ۹ ص ۵۲۸ [۲] ایضاً
[۳] البحر جلد ۸ ص ۳۷۵۔
[۴] ایضاً

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پیش ہوا تو آپ نے مجرم کو قتل نہیں کیا (اس لیے کہ شبہ ہو گیا ہوگا) بلکہ ایک ہزار دیت مقرر کی۔[۱]

۴ - ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عمرو بن امیہ نے ایک مستامن کو قتل کر دیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ دیت ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔[۲]

۵ - حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذمیوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ جزیہ اسی لیے ادا کرتے ہیں کہ اس کے عوض ان کی جان اور مال کی حفاظت کی جائے جس طرح مسلمانوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے تحت رہنے کی وجہ سے ان کی جانیں اور اموال معصوم ہوں گے۔[۳] چنانچہ ابن عیینہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "دِیَۃُ کُلِّ ذمی مثل دیۃ المسلم" یعنی ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے مساوی ہے۔

۶ - ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں سندِ صحیح کے ساتھ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر اصحاب ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ تک ہی نہیں بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی دور تک بھی اس تمام عرصہ میں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر تھی[۴] اور مراسیل ابن المسیب محدثین کے نزدیک صحاح کا حکم رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ ذمی اور مستامن کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیلِ عقلی کے جواب میں صاحبِ بحر فرماتے ہیں کہ عورت کی دیت میں کمی اس لیے نہیں ہے کہ صفتِ انوثت کو اس میں دخل ہے اور اس پر یہ کہا جائے کہ کفر اس سے بھی کم درجہ کی چیز ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت کے اندر مرد کے مقابلہ میں ملکیت کی صفت میں کمی اور نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت نکاح کی ملکیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ملکیت مرد کو حاصل ہوتی ہے۔ اس

---

[۱] مرقاۃ شرح المشکوٰۃ جلد ۷ ص ۸۰ ملتان ایڈیشن۔

[۲] البحر جلد ۸ ص ۳۷۵ - [۳] البقیہ

[۴] مرقاۃ شرح المشکوٰۃ جلد ۷ ص ۸۰

اعتبار سے کافر بھی مساوی درجہ رکھتا ہے لہٰذا وہ دیت میں بھی مسلمان کے مساوی ہوگا[۱]۔

علاوہ ازیں عورت کی دیت مرد کی دیت سے کم کسی عقلی وجہ کی رُو سے نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ اجماع صحابہ کی وجہ سے ہے[۲]۔

ذمّی کی دیت، مسلمان کی دیت سے نصف ہونے پر یا مجوسی کی آٹھ سو درہم ہونے پر جو روایات نقل کی گئی ہیں یا اُن کے علاوہ اور بھی جو اس طرح کے آثار ہیں اُن سب کے بارے میں احناف کا موقف یہ ہے کہ یہ آثار جس طرح نصف دیت پر دلالت کرتے ہیں، کامل دیت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

لہٰذا انہوں نے ان آثار کو ترجیح دی ہے جو کامل دیت پر دلالت کرتے ہیں اور وجہ ترجیح اُن کے نزدیک یہ ہے کہ یہ آثار آیت مذکورہ کے ظاہر سے زیادہ مطابقت اور موافقت رکھتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۲ | عورت کی دیت

نفس اور اعضاء میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی[۳] اور جس عضو میں دیت مقرر نہ ہو اس میں حکومتِ عدل واجب ہوگی[۴]

تشریح :-

حکومتِ عدل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک حکومتِ عدل میں مرد اور عورت برابر ہوں گے۔ اور بعض کے نزدیک عورت کی حکومتِ عدل بھی مرد کی حکومتِ عدل سے نصف ہوگی لیکن ترجیح پہلی صورت کو حاصل ہے[۵]۔

عورت کی دیت نصف ہونے کی درحقیقت وجہ یہ ہے کہ میراث اور شہادت میں مرد کے مقابلے میں عورت بمنزلہ نصف کے ہے اس لیے دیت میں بھی مرد کا نصف ہوگی[۶]

۱۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۷ ص ۷۹

۲۔ البحر جلد ۷ ص ۳۷۵ (ملتان ایڈیشن)

۳۔ الدر المختار جلد ۵ ص ۳۸۰

۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً

۶۔ البدائع جلد ۷ ص ۲۵۴

آیت مذکورہ میں عورت اور مرد کی دیت کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ البتہ صحابہ کا اجماع اس بات پر ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف واجب ہوگی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوگی، اور صحابہ میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ لہذا اس پر اجماع منعقد ہوگیا[1]۔

مشہور محدث امام بیہقیؒ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔" عقل المراۃ علی النصف من دیۃ الرجل فی النفس وما دونہا" یعنی عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی اس کا اعتبار نفس اور اعضاء دونوں پر ہوگا۔ امام شافعیؒ اسی روایت کو حضرت علیؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ دونوں سے نقل کرتے ہیں[2]۔

علامہ ابن قدامہؒ، ابن منذرؒ اور ابن عبداللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ" اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے"۔ پھر اس کے خلاف ابن علیہؒ اور اصمؒ کی مخالفت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہ دونوں مرد اور عورت کی دیت کو برابر قرار دیتے ہیں۔ لیکن علامہ ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قولِ شاذ اجماعِ صحابہ اور سنتِ رسول کے خلاف ہے[3]۔

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی، خواہ دیت نفس ہو یا نفس سے کم یعنی اعضاء کی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دیت کی مقدار تیسرے حصے تک ہو تو اس میں مرد اور عورت برابر ہوں گے البتہ تیسرے حصے سے زائد میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی[4] یہی موقف امام مالکؒ، امام احمدؒ، اور دیگر حضرات کا بھی ہے۔ یہ حضرات اسماعیل بن عیاش بروایت ابن جریج یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" عقل المراۃ مثل عقل الرجل حتی یبلغ العقل الثلث من دیتہا" یعنی عورت کی دیت مرد کی دیت کے تیسرے حصے تک

---

[1] البدائع جلد ۷ ص ۲۵۴ — [4] ایضاً

[2] المغنی جلد ۹ ص ۵۳۲

[3] الدر المختار جلد ۵ ص ۳۸۹ فصل فی الجنین۔

پہنچنے میں ایک جیسی ہوگی۔ مگر صاحب مرقاۃ نے اسماعیل بن عیاش اور ابن جریج کے بارے میں ضعیف ہونے کا قول نقل کیا ہے۔ نیز یہ حضرات زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ آپ نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ مگر یہ منقطع حدیث ہے جو احناف کی پیش کردہ دلیل کے مقابلے میں قوی نہیں ہے[۱۴]۔ علاوہ ازیں احناف فرماتے ہیں کہ روایت کے الفاظ یعنی "دیۃ المرأۃ علی النصف من دیۃ الرجل" عام ہیں۔ اس میں کوئی تخصیص مذکور نہیں ہے۔ نیز یہ کہ جب دیت نفس کے بارے میں عورت کی دیت نصف ہے۔ اور اس پر اتفاق ہے تو اعضاء جو نفس کے تابع ہیں۔ ان کے اندر بھی نصف کا اعتبار کیا جائے گا۔ ورنہ تابع (صفت) کی متبوع (موصوف) پر فوقیت لازم آئے گی جو خلاف حقیقت ہے[۱۵]۔

(باقی)

ایک گذارش

جناب قاضی بشیر احمد صاحب کے تعاون کے جہاں ہم بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے مضمون کی اشاعت کے لیے ترجمان القرآن کو پسند فرمایا، وہاں ہم معاصرین اور قارئین کی توجہ مجلہ نگاری کی اس معروف حقیقت کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ کسی مضمون کے شائع کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ شائع کرنے والا ادارہ اس کے حرف حرف سے متفق ہوتا ہے، یا ہر مضمون نگار خاص اس کے طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ قاضی صاحب نے ایک ایسے دینی مبحث پر لکھا جو بحالاتِ موجودہ اہمیت رکھتا ہے اور اسے ہم نے چھاپ دیا تاکہ مختلف ذہنوں میں متعلقہ موضوعات پر سوچنے کی تحریک ہو۔

راقم الحروف کا اپنا ذاتی نقطۂ نظر قدرے مختلف ہے۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ فقہ مذاہب اربعہ کے طرز پر مختلف ائمہ اور پیروانِ ائمہ کے ارشادات کو سامنے لا کر ان کا تجزیہ و موازنہ کرنا چاہیے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کارفرما نہیں ہونی چاہیے جو بالعموم کلام میں تلخیاں پیدا کرتی ہے۔ نیز قدیم قانونی اصطلاحات کو درج کرتے ہوئے ان کی وضاحت کرنی چاہیے۔ علاوہ ازیں نئے حالات میں بعض نئی چیزوں کو شامل بحث کرنا چاہیے۔ مثلاً قتل عمد کے منصوص آلات و ذرائع کی تعریف جن دوسری اشیاء پر منطبق ہوتی ہے، مثلاً پستول کی گولی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض مہلک شعاعوں یا برقی لہروں کا استعمال۔ اسی طرح قانونِ شہادت کے تحت ان قرائن کی حیثیت کو متعین کرنا

ضروری ہے جو جدید سائنٹفک تحقیقاتوں کے رُو سے بدیہی اور حتمی حقیقت اختیار کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اجتہادی مباحث کے بغیر قوانین فقہ پر جو مضامین لکھے جائیں گے ان میں عکاسی چند صدی پہلے کے اجتہادی فیصلوں کی ہوگی ۔ اس صورت میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ خود میرے ذہن میں بہت سے اشکال پیدا ہوئے ۔

مگر الحمد للہ کہ میرے دل میں کوئی تلخی و بیزاری مختلف حالیہ بحثوں کو پڑھتے ہوئے پیدا نہیں ہوئی بلکہ بعض جارحانہ حملوں سے بھی میں نے صرفِ نظر کیا۔

پس گذارش ہے کہ کسی رسالے اور اُس کے مضمون نگاروں کے تعلق کو صحیح طور پر سامنے رکھیے، اور اختلافات کو پیرایۂ رحمت میں پیش کیجیے۔ اہل دین کی باہمی طعن و تعریض اُن کے مخالفین کی نگاہوں میں سرے سے شریعت ہی کو بے وزن بنا دے گی۔

بعض احباب نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ پوری ایک کتاب کو بالاقساط ترجمان القرآن میں شائع کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے ۔ میرا بھی خیال یہی ہے کہ اس سلسلے میں اب کہیں رکنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے پاس صفحات کم ہیں ۔ قاضی صاحب بقیہ حصوں کو کتابی صورت میں لا سکتے ہیں۔ ترجمان القرآن میں تو صرف ایسے مضامین آنے چاہییں جو اگر ایک ہی مرتبہ نہ چھپ سکیں تو زیادہ سے زیادہ دو تین اقساط میں مکمل ہو جائیں ۔ (مرتب)

علّامہ ابن قیّم رح

جناب پروفیسر طیب شاہین لودھی

(۱)

زمان ومکان کے بُعد اور نسل وزبان کی حدبندیوں کے باوجود جن چیدہ شخصیتوں نے افکارِ انسانی کو متاثر کیا ہے ان میں ابن تیمیہ رح نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس نابغۂ وقت اور عبقریٔ دوراں نے اُس زمانے میں جنم لیا جو دشمنانِ اسلام کے تغلّب اور مسلمانوں کے انتشار کا زمانہ تھا۔ تاتاریوں نے مسلمانوں کی تقریباً تمام بڑی بڑی سلطنتوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف صلیبیوں کے مذہبی جوشِ جنوں نے امن اور چین کو تلپٹ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ساتھ اُن پر علمی اور فکری جمود طاری تھا۔ ہر طرف بیرونی نظریات کی یلغار تھی۔ تصوف کے نام پہ فارس وہند کے گمراہ کن افکار ونظریات مسلمانوں کے طرزِ فکر پہ پوری قوت سے حملہ آور تھے۔ علماء نے اس یلغار کا مقابلہ کرنے کے بجائے تاویلات کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ قرآن وسنّت کی صریح اور واضح نصوص کو تاویل کی خراد پہ چڑھا کر ان کو یونان وہند کے فلسفیانہ نظریات کے قطعی مطابق کر ناہی علم تھا اور اسلام کی عین خدمت۔ بدعات نے سنّت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور علمائے سُوء ہر بدعت کو عین سنت ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ شرک نے توحید کے پردے میں پورے مسلمان معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور توحید حیران وسرگرداں اِدھر اُدھر پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔

ابن تیمیہ رح بدعتوں، گمراہیوں اور مایوسیوں کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شہاب ثاقب بن کر نمودار ہوئے جو تاریکیوں کا جگر پاش پاش کر دیتا ہے۔ نجمِ سحر بن کر طلوع ہوئے جو نمودِ صبح کا پیغام لاتا ہے۔ وہ

گمراہیوں کے گھمبیر اُفق پر سورج بن کر نکلے جس کی کرنوں نے تمام عالم کو منوّر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مایوسیوں کے اس زمانے کے لیے ابن تیمیہؒ کو مقدّر کر رکھا تھا۔ اس مردِ خدا نے اس جہانِ آب وگِل میں قدم رکھتے ہی اپنی صلاحیت اور انفرادیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ سیف وقلم کے اس مجاہد نے گمراہیوں کے لشکروں کا دنیا کے آخری کنارے تک تعاقب کیا۔ علمِ نبوت کے چشمۂ صافی کو بدعات اور غیر اسلامی نظریات کی کدورتوں سے پاک کیا۔ اور سنتِ نبویؐ کے متعلق تمام شکوک وشبہات کا پردہ چاک کر دیا۔

اللہ تعالیٰ جب کسی شخصیت کو اعلیٰ وارفع مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے تو دُنیا میں اُس کے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ انبیاء اور صلحاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنّت ازل سے چلی آ رہی ہے۔ ذرا تاریخ کے صفحات اُلٹیے۔ مؤرّخ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ دعوتِ حق کے داعیوں کی دعوت کو حق جانتے ہوئے بھی ان کی راہ کو کانٹوں سے بھر دیا گیا۔ اُن کے لیے صلیبیں تیار ہوئیں۔ ہڈیوں سے گوشت چھیل کر الگ کرنے کے لیے لوہے کی کنگھیاں ایجاد ہوئیں، سر پر آرے چلے، اُن کو اپنے وطن سے نکال دیا گیا، ہاتھ تڑوا دیئے گئے۔ قید وسلاسل میں ڈال دیا گیا۔ اور کوڑوں سے کھال اُدھیڑ دی گئی۔ ابن تیمیہؒ بھی اسی راہ کے مسافر تھے، اور اسی روشنی کے پَر تو۔ باطل کے جھونکے اس شمعِ حق کو بجھانے کے لیے لپکے لیکن اس شمع سے شمعیں جلتی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر سُو حق کی روشنی پھیل گئی۔ اور حسد کے اندھیرے پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ابن تیمیہؒ کا روشن کردہ ایک فانوس علامہ ابن قیمؒ کی شخصیت ہے۔

جہاں کہیں اور جب بھی ابن تیمیہؒ کا تذکرہ ہوگا۔ اُن کے ساتھ اُن کے نامور شاگردِ رشید ابن قیمؒ کا نام بھی پیوستہ نظر آئے گا۔ آپ اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلامی فقہ کی تدوین کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ ایک بات جو نہایت اہم اور سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ تمام نامور فقہاء جن کی فقہ کو کسی نہ کسی اسلامی سلطنت کا دستور العمل بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اُن کے افکار کی شہرت اُن کے شاگردوں کی معرفت ہوئی ہے۔ ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، اور احمد رحمۃ اللہ علیہم کے علوم ان کے شاگردوں کی وساطت سے تمام دنیا میں پھیل گئے۔ مگر اوزاعیؒ[1]، ابن ابی لیلیٰؒ، ابو ثورؒ اور لیث بن سعدؒ

[1] ابو عمرو عبدالرحمٰن بن عمرو بن یحمد دمشقی ۸۸ھ بعلبک کے مقام پر پیدا ہوئے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے ہمعصر تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ اُن کے بعض مباحثے کتابوں میں منقول ہیں۔ امام اہلِ شام (باقی بر صفحہ آئندہ)

جیسے جہابذہ اپنے زمانے کی حدود سے باہر قدم نہ رکھ سکے۔ حالانکہ اُن کا تفقُّہ دیگر امامانِ وقت سے کسی صورت کم نہ تھا۔ امام اوزاعیؒ کو لاکھوں مسائل حفظ تھے۔ امام شافعیؒ خود کہا کرتے تھے "لیث"، مالکؒ سے زیادہ فقیہ ہیں"۔ حالانکہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ کے اُستاد تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو قاضی ابویوسف[1]ؒ، امام محمدؒ[2]

(حاشیہ صفحہ سابقہ) کے لقب سے مشہور تھے۔ بہت فصیح اللسان تھے۔ ۱۵۷ھ میں بیروت کے مقام پر وفات پائی۔

۲؎ ابوعبدالرحمٰن محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ عراق کے علماء میں سے ایک بلند مرتبہ عالم تھے۔ شعبی، نافعؒ، عطاءؒ بن ابی رباح اور دیگر علماء سے اکتساب علم کیا، قاضی کے عہدے پر فائز تھے، ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔

۳؎ ابوعبداللہ ابراہیم بن خالد بن ابی الیمان کلبی بغدادی اپنے وقت کے بہت بڑے فقیہ تھے۔ ابوثورؒ ان کا لقب تھا۔ اہلِ بغداد ان سے فتویٰ لیا کرتے تھے۔ سفیان بن عیینہؒ، وکیع، اور امام شافعیؒ جیسے جہابذہ سے علم حاصل کیا۔ امام احمدؒ کے ہمعصر تھے۔ امام احمدؒ ان کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

۴؎ ابوالحارث لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن فہمی فارسی النسل تھے۔ ۹۴ھ میں مصر میں فسطاط کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ نافعؒ، یحییٰ بن سعید انصاریؒ، زہریؒ، ہشام بن عروہ، عطاء بن ابی رباحؒ اور دیگر علماء سے علم حاصل کیا۔ امام احمدؒ فرمایا کرتے تھے "لیث" کثیر العلم اور صحیح الحدیث ہیں۔ اہلِ مصر کے مفتی اور اپنے وقت کے امام تھے۔ ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔

۱؎ (حاشیہ صفحہ ہذا) ابویوسفؒ یعقوب بن ابراہیم ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر حدیث روایت کرنے لگے۔ ہشام بن عروہ، ابواسحاق شیبانی، عطاء بن السائب اور دیگر علماء سے اکتسابِ علم کیا۔ ابن ابی لیلیٰ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ امام ابوحنیفہؒ کے حلقۂ درس میں حاضر ہوئے اور شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اُن کے مذہب پر کتابیں لکھیں اور اُن کے مذہب کی اشاعت کا باعث بنے۔ عباسی سلطنت میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے بڑھ کر کثیر الحدیث تھے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ امام شافعیؒ قاضی ابویوسفؒ کے شاگرد رہے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ قاضی ابویوسفؒ امام شافعیؒ کے بغداد آنے سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ "کتاب الخراج" ان کی مشہور تصنیف ہے۔

۲؎ امام محمد بن حسن بن فرقد شیبانی ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں نشوونما ہوئی۔ ابوحنیفہؒ سے اُن کی فقہ سیکھی، مگر اُن کے حلقۂ درس میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکے، کیونکہ جناب امام صاحب کا (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور امام زُفر[1] بن ہُذیل رحمہ جیسے شاگرد میسر نہ آتے تو اُن کی فقہ عباسی، ترک اور مغل سلطنتوں کا ضابطہ قانون نہ بن سکتی۔

اگر امام شافعیؒ کے شاگردوں میں سلیمان بن ربیعؒ[2] اور مزنیؒ[3] جیسے اصحاب نہ ہوتے تو امام شافعیؒ کی فقہ مصر کا لائحہ قانون نہ بن سکتی تھی۔ اسی طرح حافظ ابن قیمؒ نے جہاں اپنے اُستاد کی زندگی میں اُن کے شانہ بشانہ کام کیا۔ وہاں اُن کی وفات کے بعد اُن کے فکر کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔ اپنے استاد اور اُن کے فکر کی خاطر قید و بند کی صعوبتوں کا بھی نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

ولادت اور تربیت شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر ۶۹۱ھ مطابق ۱۲۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مشہور مدرسہ جوزیہ کے قیم تھے۔ اسی لیے آپ تاریخ میں ابن قیم کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ نام اس قدر مشہور ہے کہ بہت سے لوگوں کو اُن کے اصلی نام تک کا علم نہیں۔ بعد میں ابن قیمؒ اس مدرسہ کے سربراہ

(حاشیہ صفحہ سابقہ) انتقال ہو گیا تھا۔ قاضی ابو یوسفؒ کے پاس اپنے علم کی تکمیل کی۔ امام مالکؒ سے مؤطا کی سماعت کی۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اشاعت زیادہ تر امام محمد کی وساطت سے ہوئی۔ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) امام زفر بن ہذیل بن قیسؒ کوفی ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے تھے جس کا خود امام ابوحنیفہ کو بھی اعتراف تھا۔ ۱۵۸ھ میں فوت ہوئے۔

[2] ابو محمد ربیع بن سلیمان بن عبدالجبار بن کامل المرادی مصری امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور اُن کی کتاب کے راوی ہیں۔ طحاویؒ کے مطابق ۱۷۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعیؒ کے علاوہ دیگر بہت سے علماء سے اکتساب علم کیا۔ بعض لوگوں نے امام شافعی سے ان کی روایت کو مشکوک ٹھہرانے کی کوشش کی ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ ۲۷۰ھ میں فوت ہوئے۔

[3] ابو ابراہیم اسماعیل بن یحیٰی مُزنی مصری ۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ ۱۹۹ھ میں جب امام شافعیؒ مصر میں تشریف لائے تو اُن سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اُن کی لکھی ہوئی کتابوں پر امام شافعیؒ کے مذہب کا دارومدار ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے اُستاد کی مخالفت کر جاتے ہیں، جیسا کہ متقدمین کا طریقہ تھا۔ ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

بھی رہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے اپنے زمانے کے بہت سے نامور علماء سے اکتساب علم کیا جن میں علی الشہاب النابلسی[1]، ابوبکر ابن عبد الدائم[2]، محمد بن ابی الفتح البعلبکی[3] اور دیگر بہت سے علماء شامل ہیں۔ مگر جب وہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی خدمت میں حصول علم کی خاطر حاضر ہوئے تو بس اُن ہی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنے عظیم المرتبت استاد سے اس قدر متأثر ہوئے کہ اُن کے رنگ میں رنگ گئے۔ فکر و نظر میں ابن تیمیہؒ کی نہج کو — جو کہ درحقیقت سنت نبوی اور طریقۂ سلف کی منہاج تھی — اختیار کر لیا۔ اہلِ زیغ اور منحرفین کے خلاف قلمی جہاد میں اپنے شیخ ابن تیمیہ کا پورا پورا ساتھ دیا اور اس راہ میں پیش آنے والی قید و بند اور تمام صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ اُن کی عظمت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ[4] جیسے جلیل القدر مفسر اور مؤرخ اور حافظ ابن رجب[5] مؤلف "الذیل علی طبقات الحنابلۃ" جیسے عالم نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور بعد

---

[1] ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن بن عبدالمنعم مقدسی نابلسی ۶۳۰ھ میں نابلس کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بہت سے علماء سے علم کی تحصیل کی فلسطین میں مفتی رہے۔ امام ذہبیؒ نے بھی ان سے اکتساب علم کیا ہے۔

[2] زین الدین ابوبکر احمد بن عبدالدائمؒ ۶۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ حافظ ضیاءؒ اور ناصحؒ کے علاوہ دیگر علماء سے علم حاصل کیا۔ بڑے عابد قسم کے انسان تھے۔ ۷۱۸ھ میں وفات پائی۔

[3] شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی الفتح البعلی ۶۴۵ھ میں بعلبک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے بلند پایہ علماء سے علم حاصل کیا۔ لغت عربی اور نحو کا علم ابن مالکؒ سے حاصل کیا۔ انہوں نے لغت، نحو اور فقہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ امام ذہبیؒ اور ابن قیمؒ جیسے علماء نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۷۰۹ھ میں قاہرہ میں وفات پائی۔

[4] حافظ ابن کثیر — عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش دمشق ہے۔ ان کو ابن تیمیہؒ سے بھی رشتۂ تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ ۷۷۴ھ میں فوت ہوئے۔ بہت سی کتابیں لکھیں۔ تفسیر ابن کثیر اور البدایۃ والنہایۃ بہت مشہور ہیں۔

[5] زین الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن شہاب الدین ابن رجب بغدادی دمشقی۔ ان کی (باقی برصفحہ آئندہ)

میں آنے والے ہر زمانے میں بلند پایہ علماء استاد اور شاگرد دونوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔
ابن قیمؒ تمام عمر تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ اپنے استاد کی طرح ٹھیٹھ اسلامی نظریات کی اشاعت میں کوشاں رہے۔ آخر بتاریخ ۱۳ رجب ۷۵۱ھ، بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کو عشاء کے وقت وفات پائی اور دمشق میں باب صغیر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حافظ ابن قیمؒ کی شخصیت

ابن قیمؒ میں اپنے استاد کی پوری شخصیت منعکس ہے۔ عقیدے کا وہی رسوخ، علم کی وہی گہرائی اور کتاب و سنت کے ساتھ وہی شیفتگی و پیوستگی نظر آتی ہے۔ ناقابلِ تسخیر دلائل کے ساتھ باطل کے سامنے ڈٹ جانے کا وہی عزم دکھائی دیتا ہے جو استاد کا تھا۔ علامہ ابن قیمؒ قدس اللہ روحہٗ کا مطالعہ کیجیے۔ ان کی تحریر ایک عجیب اثر رکھتی ہے۔ دل میں اتر جانے والا انتہائی سادہ اسلوب جو قرآنی اندازِ بیان سے عکس پذیر ہے۔ سلیس مگر نہایت بلیغ اندازِ بیان کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ اندازِ بیان میں اپنے استاد کی نسبت قدرے نرم اور تکرار سے کسی قدر دُور رہیں۔ ان کے دلائل میں دریا کی بپھری ہوئی موجوں کی سی قوت ہے، جن کے سامنے مخالفین کے دلائل کا بند تنکوں کا انبار اور ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔ استنباط میں سمندر کی گہرائی ہے جس کی تہہ کا پتہ نہیں چلتا اور عبارت میں پہاڑی ندی کے سے نغمے۔ ابن کثیرؒ ان الفاظ میں ان کی شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہیں:-

"ابن قیمؒ رات دن علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ کثرت سے نماز پڑھنے اور بہت زیادہ تلاوت کرتے تھے۔ حسنِ اخلاق سے آراستہ تھے۔ بہت زیادہ محبت اور مودّت سے کام لیتے تھے۔ حسد و کینہ سے بالکل خالی تھے۔"

حافظ ابن حجرؒ[1] ان کے مرتبے کا یوں اعتراف کرتے ہیں:-

"ابن قیمؒ بڑے جرأت مند اور بہت وسیع العلم تھے۔ مذاہبِ سلف اور ان کے اختلافات

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن حجر نے ۷۳۶ھ لکھی ہے۔ اور دائرۂ معارف اسلامیہ نے اسے ترجیح دی ہے۔ بہت سے فحول علماء سے اکتسابِ علم کیا۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے "الذیل علی طبقات الحنابلۃ" مشہور ہے اور یہی کتاب ان کی شہرت کا باعث ہے۔ ۷۹۵ھ میں دمشق میں فوت ہوئے۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد العسقلانی ۷۷۳ھ میں پرانے قاہرہ (باقی برصفحہ آئندہ)

کی کامل معرفت رکھتے تھے۔"

ابن قیمؒ کے نظریات ابن قیمؒ کے فکر کی منہاج کتاب وسنت ہے اور دیگر فقہائے حدیث خصوصاً امام احمدؒ کی طرح اس سے سرِ مو انحراف کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے بعد اجماعِ صحابہ اور اجماعِ مسلمین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور فتاویٰ صحابہ کو اپنے استنباط میں مشعلِ راہ بناتے ہیں۔ اور اس کے بعد نص کی عدم موجودگی میں قیاس سے کام لیتے ہیں۔ اور یہی وہ طریقِ استنباط ہے جو صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے۔ اور قرنِ اوّل کے تمام فقہاء و محققین نے اسے اصولی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اور کم وبیش انہی خطوط پر اسلامی فقہ کی تدوین ہوئی ہے

قیاس کے سلسلے میں ابن قیمؒ فقہائے حدیث کے طرزِ عمل کا نہایت سختی سے التزام کرتے ہیں۔ وہ قرآن وسنّت کی نصوص پر کسی ذوق و وجدان یا کشف اور قیاس کی تحکیم قبول نہیں کرتے۔ قیاس کے مقابلے میں قرآن اور سنّت کی نصوص کی عظمتِ شان کو کم نہیں ہونے دیتے۔ قرآن وسنّت اور اجماعِ صحابہؓ کے سامنے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے قول کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ بایں ہمہ وہ قیاس کو نہایت احسن طریقے سے استعمال کرتے ہیں جس کی مثالیں ان کی وسیع تصنیفات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ خصوصاً انہوں نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

قرنِ اوّل ہی سے قیاس کے سلسلے میں فقہاء کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو استدلال و استنباطِ احکام میں قیاس کو قطعاً رد کر دیتا ہے۔ اور دوسرا گروہ قیاس کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ قرآن اور سنّت کی واضح نصوص بھی قیاس کے مقابلے میں معدوم نظر آتی ہیں۔ قیاس کے حامی علماء کے گروہ میں سے بعض متاخرین نے "صحابیٔ فقیہ" کی روایت اور "صحابیٔ غیر فقیہ" کی روایت میں فرق کر کے ذخیرۂ حدیث کا کچھ اس طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے کہ عملاً سنّت قیاس کے مقابلے میں نہایت ضعیف اور بے بس نظر آتی ہے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے زمانے تک فقہاءِ حدیث کی منہاج پر خلافِ قیاس ہونے کا الزام چسپاں رہا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) پیدا ہوئے بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا علامہ بلقینی، علامہ ابن الملقن اور عز الدین جیسے علماء سے علم حاصل کیا۔ علامہ زین الدین عراقی سے حدیث کی سند لی۔ ۱۵۰ سے لگ بھگ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں بخاری کی شرح فتح الباری، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، تہذیب التہذیب، لسان المیزان اور تلخیص الحبیر زیادہ مشہور ہیں۔ ۸۵۲ھ میں وفات پائی۔

ہے۔ لیکن ان دونوں حضرات نے آتے ہی مخالفین کے اعتراضات پرکاہ کی طرح اُڑا دئے اور حدیث صحیح پر خلافِ قیاس و عقل ہونے کا الزام ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

ابن قیمؒ اپنے محترم استاد اور دیگر فقہائے سنّت کی طرح مسائل میں استصحابِ اصل، مصالحِ مرسلات، ذرائع، عرفِ عام اور استحسان کے اصولوں کو خاص طور پر مدِ نظر رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن کی بنا پر زمان و مکان اور احوال کے تغیّر و تبدّل کے باوجود اسلامی قانون میں تازگی رہتی ہے۔ اور اجتہاد کے باعث اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑتا رہتا ہے۔ اسلام کے دفعِ حرج اور جلبِ سہولت کے اصولوں کی بنا پر ہر زمانے اور ہر جگہ کے احوال کے مطابق سہل اور قابلِ عمل راہ متعیّن کی ہے۔ ائمہ مجتہدین اور فقہاء نے عموماً اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے خصوصاً ان اصولوں کو اپناتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ شارع کے اصل مقاصد سے ہم آہنگی قائم رہے۔ اور اسلامی قانون کی رُوح اور اُس کے مقاصد نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ (باقی)

تصحیح

ترجمان القرآن ماہ مارچ کے ص ۴۳ پر دو چیزوں کی تصحیح کر لی جائے۔

- ایک یہ کہ مولانا کی پیدائش کا سن ۱۳۳۱ھ نہیں بلکہ ۱۳۲۱ھ ہے۔
- دوسرے یہ کہ مودود حضرت ناصر الدین ابو یوسف کا لقب نہیں بلکہ حضرت قطب الدین کا لقب تھا۔ حضرت قطب الدین مودود سے منسوب ہو کر یہ خاندان مودودی کہلایا۔

- سیرت سرورِ عالم جلد اوّل ص ۱۰۱ کے حاشیے کے آخر میں حسبِ ذیل عبارت بڑھا لی جائے۔

صرف حضرت شعیبؑ آئے تھے، سو اُن کی نبوت صرف مَدیَنؑ اور اَیکہ تک محدود رہی اور وہ بھی حضورؐ سے تقریباً ۱۸ سو برس پہلے گذر چکے تھے۔

- ص ۳۳۵ کے سامنے جو نقشہ درج ہے اس میں اَرِیحا کا مقام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ صحیح مقام دریائے اردن کے بحیرہ مردار میں داخل ہونے کی جگہ سے متصل واقع ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

جناب ڈاکٹر محمد اسحٰق - متعلم کلیۃ الحدیث مدینہ منورہ

سوا لاکھ سے زائد لعل و گہر، نیز بیش بہا انمول موتی جن کو خدا کے فرستادہ رسولؐ نے جزیرہ نمائے عرب کے ساحل سے ایک ایک چن کر کے جمع کیا، اور پھر ان جواہرات اور ہیروں کو اسلام کے آبِ مطہر سے غسل دیا، جس کے نتیجے میں اِن جواہراتِ انسانیت کی ساری کثافتیں دُھل گئیں - اور یہ اپنی اصلیت و عکسیت کے طبعی نور میں چمکنے دمکنے لگے - ان کی لمعانیوں سے دُنیائے ظلام نے نور حاصل کیا -

انسانیت کے ان قیمتی نمونوں میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ بن عمر کی تھی، جن کا مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے -

عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک و مسعود دَور دیکھا -

خلفائے راشدین کے پُرخلوص دَور سے گذرے -

امیر معاویہؓ کاتبِ وحی کا دَورِ حکمرانی دیکھا -

امویوں کا دَور دیکھا اور ننگِ انسانیت حجاج بن یوسف الثقفی الشقی کے المناک و عبرتناک دَور کا سامنا کیا -

آپ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرے بڑے حافظ و راوی حدیث ہیں - آپ کی مرویات ۲۶۳۰ ہیں -

ابن عمرؓ نے ابوبکرؓ صدیق، عمرؓ الفاروق، عثمانؓ ذوالنورین، السیدۃ عائشہؓ صدیقہ، السیدۃ حفصہؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔

ابن عمرؓ سے سعید بن مسیب، حسن البصری، ابن شہاب الزہری، ابن سیرین، نافع، مجاہد، طاؤس عکرمہ اور متعدد کبار اتباع التابعین نے روایت کیا ہے۔

ذیل میں اُن کی شخصیت اور کام کا ایک خاکہ پیش ہے۔

تسمیہ | آپ کا اسم گرامی عبداللہ اور کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی، مگر ابن عمر رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

خاندان | ابن عمرؓ کا سلسلہ نسب نویں پشت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

تاریخ پیدائش | آپ کی تاریخِ پیدائش میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک آپ نبوت کے پہلے سال پیدا ہوئے۔ بعض دوسرے یا تیسرے سال کی تاریخ بتاتے ہیں۔ مگر راجح تاریخِ پیدائش سنہ ۲ نبوی مطابق ۶۱۱ء ہے۔

حلیہ | شکل و شباہت میں والدِ ماجد سے مماثلت تھی۔ قد لمبا، جسم بھاری، رنگ گندمی، داڑھی قبضہ بھر، مونچھیں خوبی سے کاٹی ہوئیں۔ جس کی وجہ سے لبوں کی سفیدی نمایاں، بال کاندھوں تک، سیدھی مانگ، (بڑھاپے میں زرد خضاب استعمال کیا)۔

لباس | معمولی موٹا پائجامہ، سیاہ عمامہ اور پاؤں میں سادہ سی چپل، کبھی کبھار قیمتی لباس زیب تن فرماتے تاکہ کفرانِ نعمت نہ ہو۔ انگوٹھی پر عبداللہ بن عمرؓ کندہ تھا جو مہر کا کام بھی دیتی تھی۔

ذریعہ معاش | تجارت پیشہ تھے، مدینہ کے مقدس بازاروں میں اُونٹوں کے تاجر تھے۔ علاوہ ازیں عہدِ رسالتؐ میں جاگیر بھی عطا ہوئی تھی جس سے لگان ملتا تھا۔ عہدِ فاروقیؓ میں ڈھائی ہزار وظیفہ ملتا تھا پہلے عہدِ عثمانیؓ، پھر عہدِ بنواُمیہ میں وظیفہ میں اضافہ ہوا سخی اور فیاض دل تھے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس لیے دولت باعثِ عشرت نہ بن سکی۔ آخری عمر میں عسرت و افلاس سے دوچار رہے۔

وفات | جنابِ ابنِ عمرؓ کی وفات حسرت آیات سنہ ۷۴ھ میں ہوئی۔

عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔ مزاج شناسِ رسول کے زاہد و عابد فرزندِ جلیل حضرت عبداللہ بن عمر چار معروف عبادلہ میں سے ایک عبداللہ تھے۔ باقی تین عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص اور عبداللہ بن زبیر نادرِ روزگار شخصیات تھیں۔ آپ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے، اور اس فاروقؓ کے بیٹے جس کے متعلق تاجدارِ مدینہ ختم الرسل نے فرمایا تھا کہ "لو کان بعدی نبیاً لکان عمر نبیاً الا انہ لا نبی بعدی" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ نبی ہوتے، مگر آگاہ رہو کہ میرے

بعد کوئی نبی نہیں۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ زہد و تقویٰ اور علم و فضل میں امتیازی خصوصیت اور منفرد شان کے مالک تھے۔ ان کی نسبت سے کہا جاتا ہے کہ "جس نے بھی دُنیا کو پایا اس پر دُنیا مائل ہو گئی یا وہ دُنیا پر مائل ہو گیا۔ لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہ نہ دُنیا پر مائل ہوئے اور نہ دُنیا اُن پر مائل ہو سکی"۔

عبداللہ بن عمرؓ نے سنّت کو روایات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنے عمل و کردار میں زندہ رکھا۔

روایت حدیث اور اتباعِ سنّت

حدیث سید المرسلین کے حافظ و عاشق سات جلیل القدر نابغہ روزگار شخصیات جن کو محدثین کی صف میں سات مکثرین "کثرت سے روایت کرنے والوں کے" خطاب سے نوازا گیا۔ ان میں سے دوسرے نمبر پہ آپ کا اسم گرامی تا قیامت منقش ہو چکا ہے۔ مکثرین کے اسم گرامی یہ ہیں:

۱۔ حضرت عبدالرحمن ابوہریرۃ ۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر ۳۔ حضرت انس بن مالک۔
۴۔ حضرت السیدۃ عائشہ ام المومنین ۵۔ حضرت عبداللہ بن عباس ۶۔ حضرت جابر بن عبداللہ۔
۷۔ اور حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہم

آپ سے دو ہزار چھ سو تیس (۲۶۳۰) احادیث مروی ہیں۔ اصح الاسانید کے نام سے جو سلسلۃ الذہب آپ سے روایت کرتا ہے اور علمائے محدثین کے ہاں معروف ہے، وہ ہے:

"مالك عن نافع عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما"

آپ بہت سے خصائص و مناقب کے حامل تھے۔ آپ کو ختمی الرسل احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو والہانہ عشق تھا وہ آن کا ہی خاصا تھا۔ ابن عمرؓ کی پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین و دلکش زندگی کا پرتوِ جمیل تھی۔ ابن عمرؓ سنّتِ رسول کے اس قدر شدید عامل تھے کہ جہاں بھی رسول اللہ نے حضر و سفر میں نماز ادا کی آپ نے وہاں نماز ادا کی، جہاں آپ نے آرام فرمایا وہاں آپ نے آرام کیا، اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ثانیے توقف کیا وہاں ابن عمرؓ نے توقف کیا۔

صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ علیہ وسلم مسجد قباء میں سوار اور پیدل دونوں صورتوں سے تشریف لے جاتے تھے۔ ابن عمرؓ کا بھی یہی عمل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں اُتر کر نماز پڑھی۔ ابن عمرؓ بھی ذوالحلیفہ میں اُتر کر نماز پڑھتے تھے۔

عبادت کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی اسوۂ نبوی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ رنگوں میں زرد رنگ پسند کرتے اور اسے استعمال کرتے تھے۔ چپل پہنتے تھے۔ غرضیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حرکات و سکنات جو آپ سے بر سبیلِ سنّت یا طبعاً صادر ہوئیں۔ ابنِ عمر ان سب کی اقتدا ضروری سمجھتے تھے۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ ابنِ عمر رض وہ ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ حضرت عائشہ رض صدیقہ ام المومنین فرماتی ہیں کہ عہدِ نبوی کے حالات و کیفیات کا عبداللہ بن عمر رض سے زیادہ کوئی واقف نہیں۔

آپ امینِ حدیث تھے۔ محمد بن علی کہتے ہیں کہ میں نے کسی صحابی کو رسول اللہ سے اس طرح حدیث بیان کرتے نہیں پایا۔ مگر عبداللہ بن عمر رض کو۔ یعنی سنی ہوئی حدیث کو نہ زیادہ کیا نہ کم کیا، بلکہ فرمائی ہوئی حدیث کو من و عن روایت کیا۔

ابنِ عمر رض کی چند مرویات اسلام کی بنیادی تعلیمات اور دیگر شعبوں سے متعلق آپ کی کثیر التعداد مرویات، احادیث کی کتب میں سچے موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ جن کو محدثین کرام نے کتبِ حدیث میں مختلف ابواب میں مزین و منقش کر دیا ہے۔

حدیث "بنی الاسلام علی خمس" عن ابن عمر رضی اللہ عنھما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بُنِیَ الاسلامُ علیٰ خَمسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ واَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ"۔

(ابن عمر رض سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے۔ کلمۂ توحید اور رسولؐ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور روزے رمضان کے رکھنا"

حدیث تلبیۃ عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنھما اَنَّ تَلْبِیَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، ان الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکُ لَاشَرِیْکَ لَکَ"۔

(ابن عمر رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ حج اور عمرہ کا تلبیہ یوں کہتے، حاضر ہوں اے اللہ حاضر ہوں۔

نہیں شریک ہے تیرا۔ حاضر ہوں۔ بے شک تعریف اور نعمت تیرے لیے ہے کہ تو صاحب ملک ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں۔"

حدیث عابر السبیل | "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ"۔

(دنیا میں اس طرح گذر بسر کر کہ گویا تو پردیسی ہے یا راہرو)

حدیث اللحیۃ والشارب | عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ، وَفِّرُوا اللِّحَى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ"۔

(مشرکین کی مخالفت کرو داڑھی بڑھاؤ مونچھیں کٹاؤ۔)

"وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلَى لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ"

(حضرت ابن عمر حج اور عمرہ کے موقع پر اپنی ڈاڑھی کا قبضہ سے زائد حصہ کٹوا دیتے)

زہد و اتقاء | آپ نے اپنی ساری عمر میں ایک ہزار عمرے ادا کیے اور ساٹھ حج۔ آپ خوف آخرت سے اکثر ترساں و لرزاں رہتے تھے۔ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آخرت کا سبق دینے والے میرے آقا و مربی رسول خدا ہیں۔ ایک دن رسول خدا نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر فرمایا۔ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" یعنی دنیا میں اس طرح رہ جیسے تو پردیسی یا راہ گیر ہے۔ اس روایت کو ابن عمرؓ سے بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے روایت کیا ہے۔

چنانچہ ابن عمرؓ اس ارشاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے متاثر ہوئے کہ صحابہ کرامؓ کہنے لگے کہ رسول اللہ کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ بدل گیا۔ مگر نہ بدلے تو عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں۔

"ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے دنیا نے اپنی طرف مائل نہ کیا ہو یا وہ خود دنیا کی طرف مائل نہ ہوا ہو۔ لیکن ابن عمرؓ نہ دنیا کی طرف مائل ہوئے اور نہ دنیا ان کی طرف مائل ہوئی"۔

حذیفہؓ بن یمان کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ بدل گیا مگر نہ بدلے تو عبداللہ بن عمرؓ۔

کسی نے نافع سے پوچھا "مجھے کوئی ایسا شخص بتاؤ جو بیک وقت عابد و زاہد بھی ہو، متقی و پرہیزگار بھی، خوش الحان قاری بھی اور یوم آخرت سے ڈرنے والا بھی، میں اس کے عقد میں اپنی بیٹی دینا چاہتا ہوں"۔ حضرت نافع نے کہا کہ تم عبداللہ بن عمرؓ کے پاس جاؤ یا عبداللہ بن جعفر کے پاس۔

امام شعبی سے سفیان ثوری روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ عبد اللہ بن زبیرؓ، مصعبؓ بن زبیر، عبد الملکؒ بن مروان اور عبد اللہ بن عمرؓ چاروں خانہ کعبہ میں جمع تھے۔ سب کی رائے ہوئی کہ رکن یمانی کو تھام کر خدا سے اپنی دلی تمناؤں سے متعلق دعا مانگیں۔ سب نے اپنی اپنی دلی مراد سے متعلق دعا مانگی۔ آخر میں عاشقِ صادق نے جو دعا مانگی اُس سے اُن کے زہد و ورع اور خشیتِ الٰہی کا اندازہ ہوتا ہے:

"یا اللہ تو رحمٰن و رحیم ہے۔ میں تیری اس رحمت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں کہ جو تیرے غضب پر غالب ہے کہ تو مجھے آخرت میں رسوا و ذلیل نہ کرے اور اُس عالم میں مجھے جنت عطا فرمائے۔"

ایک دفعہ ابن عمرؓ نے عبید بن عمر سے یہ آیت سُنی:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝

(اے پیغمبر! اس دن (یوم آخرت) کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت سے ایک گواہ لا کر کھڑا کر دیں گے، اور ان (تمہارے لوگوں) پر تم سے گواہی لیں گے۔

اِن آیات کا سُننا تھا کہ آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ داڑھی اور گریبان تک آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اللہ اکبر!

جو انسان خوفِ خدا اور روزِ جزا سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں ان کا دامن زہد و تقویٰ کے آبدار موتیوں سے سدا بھرا رہتا ہے۔ اس صفت میں ابنِ عمرؓ کا دامنِ حیات بھی بہت گرانبار تھا۔ اور گرانبار کیوں نہ ہوتا، ابنِ عمرؓ کے ایک خواب کی تعبیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ کو بشارت دی تھی کہ "عبد اللہ رجل صالح" اور یہ اس بشارت کا نتیجہ تھا کہ جوانی ہی میں عبد اللہ کی پیشانی سے زہد و ورع کا نور چمکتا تھا۔

طاؤس کا بیان ہے کہ ابنِ عمرؓ سے بڑھ کر کوئی متقی و پرہیزگار نہیں۔

امام زین العابدین کہا کرتے تھے کہ زہد و تقویٰ اور اصابتِ رائے میں ابنِ عمرؓ ہم سب پر فائق تھے۔

عبد اللہ بن عامر نے آپ کی خدمت میں یکے بعد دیگرے بیس بیس ہزار کی رقم بھیجی۔ آپ نے فرمایا: کہیں یہ رقم مجھے فتنہ میں نہ ڈال دے۔ آپ نے یہ رقم کھڑے کھڑے وہیں تقسیم کر دی۔

سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں کسی کے جنتی ہونے کی گواہی اگر دے سکتا ہوں تو وہ ابنِ عمرؓ ہیں۔

میمونؒ ابن مہران کہتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ سے زیادہ متقی اور پرہیزگار نہیں دیکھا۔
مسلم بن عبدالرحمٰنؒ کہتے تھے کہ میں نے ابنِ عمرؓ کے انتقال کے بعد ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ وہ فضیلت میں مثلِ عمر رضی اللہ عنہ تھے۔

عوام دعائیں مانگا کرتے تھے کہ خدایا جب تک ہم زندہ ہیں تو ابنِ عمرؓ کو زندہ رکھ تاکہ ہم اُن کی پیروی کرسکیں۔ اُن سے بڑھ کر کوئی عہدِ رسالتؐ کا واقف کار نہ تھا۔ اس وقت کے صحابہ کرام اور کبار تابعین آپ کی فضیلت کے زبردست حد تک معترف تھے۔ اور آپ سے والہانہ محبت و شیفتگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن عمرؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مجھ سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ اگر میں اُن کی محبت چاندی اور سونے کے بدلے خریدنا چاہوں تو نہیں خرید سکتا۔

پیٹ بھر کر کھانا کبھی نہ کھاتے تھے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ زاہدانہ زندگی میں خلل واقع نہ ہو۔ ابن سعید کا بیان ہے کہ آپ کے غلام عبداللہ بن عدی عراق سے واپس آئے تو آپ کی خدمت میں تحفہ پیش کیا۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ غلام بولا: یہ تحفہ چورن ہے اگر کھانا ہضم نہ ہوتا ہو تو اس کے کھانے سے کھانا ہضم ہوجاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں نے تو مہینوں سے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا ہی نہیں۔

محبتِ رسولؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس قدر محبت وعشق تھا۔ چنانچہ رسول خدا کی وفات کے بعد اس قدر ملول اور شکستہ دل ہوئے کہ عمر بھر نہ کوئی مکان بنایا اور نہ باغ لگایا۔ جب بھی رسولؐ اللہ کی یاد آجاتی بے قابو ہوکر رونے لگتے۔ اور دیر دیر تک روتے رہتے۔ یحییٰ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اساتذہ سے سُنا کہ بعض لوگ ابنِ عمرؓ کو مجنون کہنے لگے۔ زید بن عبداللہ کہتے ہیں کہ جب بھی کبھی ابنِ عمرؓ کی زبان پر رسولؐ اللہ کا نام گرامی آتا تو اُن کی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں۔ سبحان اللہ! جب غزواتِ رسولؐ کے مقامات سے گذر ہوتا تو آنکھوں کے سامنے رسولؐ اللہ اور صحابہ کرامؓ کا نقشہ آجاتا۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا۔ کیونکہ آپ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ دیارِ حبیبؐ سے اس قدر محبت و اخلاص تھا کہ افلاس کے باوجود یہاں سے نکلنا پسند نہ کرتے۔ کہا کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص مدینۂ طیبہ کے مصائب پہ صبر کرے گا قیامت کے روز میں اُس کی شفاعت کروں گا۔ (مسند احمد بن حنبل)

محبتِ اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی محبت کا فطری تقاضا تھا کہ اہلِ بیتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسی ہی غیر معمولی محبت ہو۔ چنانچہ فضائل اہلِ بیت سے متعلق جو

روایاتِ کتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے متعدد روایات مثلاً
"اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ تمام عورتوں میں افضل ہیں"۔
"اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رسول اللہ کی محبوب بیوی ہیں"۔
"فاطمہ رضی اللہ عنہا جگر گوشۂ رسول ہیں"۔
"علی رضی اللہ عنہ اسد اللہ الغالب اور آخرت میں رسول اللہ کے بھائی ہیں"۔
"حسن وحسین رضی اللہ عنہم جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور باغِ دُنیا کے دو پھول ہیں" وغیرہ وغیرہ ابنِ عمرؓ سے منقول ہیں۔

اہلِ بیت میں خصوصاً حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے دلی محبت تھی۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں: کہ جس وقت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ابنِ عمرؓ کو مدینہ منورہ میں معلوم ہوا تو وہ سخت مضطرب و پریشان ہوئے اور دشوار گذار سفر کر کے مدینہ سے مکہ آئے اور ابن عمرؓ نے کہا:

"اے ابنِ عم! اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا و آخرت دو میں سے ایک قبول کرنے کا اختیار دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا پر آخرت کو ترجیح دی۔ آپ چونکہ رسول اللہ کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اس لیے آپ بھی آخرت ہی کو اختیار کیجیے"۔

یہ سن کر حضرت حسینؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور فرمایا کہ اب تو میں عزم کر چکا ہوں۔ آپ کا عزم دیکھ کر ابنِ عمرؓ رو پڑے اور آنسوؤں کے قطروں کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو الوداع کہا۔

حق گوئی و بیباکی امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ تذکرۃ الحفاظ میں آن کی حق گوئی اور بے باکی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

اُمتِ مسلمہ کا ایک ظالم و فاسق جو حجاج بن یوسف ثقفی الشقی کے نام سے بدنام ہے۔ جس نے اپنی شقاوتِ قلبی سے اس اُمتِ مسلمہ کے ساٹھ ہزار سے زیادہ جلیل القدر مسلمانوں کو بے دردی سے شہید کروایا۔ بعض تاریخ نگاروں کے بقول اس ظالم نے بیس ہزار عظیم المرتبت صحابہ کرام کو شہید کروایا۔ جبکہ چالیس ہزار تابعینؒ کو عبداللہ بن زبیرؓ، انس بن مالکؓ اور عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل المرتبت صحابہ کرام کو جہاں شہید کروایا وہاں اس ظالم نے سعید بن جبیرؒ جیسے فقیہ المدینہ کو بھی شہید کرایا۔ ایک دفعہ بیت اللہ میں ظالم حجاج خطبہ دے رہا تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ کھڑے ہو کر فرمانے لگے، دشمنِ خدا نے حرام کو حلال بنا لیا، خانہ خدا کو برباد کیا اور اولیاء اللہ کو قتل کیا۔

حجاج نے اپنے خطبہ میں یہ بھی کہا تھا کہ: "عبد اللہ بن زبیرؓ نے کلام کو تبدیل کر دیا ہے"۔

حضرت ابنِ عمر رضؓ نے اس کے جواب میں فرمایا: "تو جھوٹ بکتا ہے، نہ ابن زبیر کلام اللہ کو بدل سکتا ہے اور نہ تو"۔

حجاج نے کہا: "تو بڑھا کھوسٹ ہے"۔

جناب عبد اللہ نے فرمایا: "اگر تو لوٹ کر جوان بن جائے تو بھی میں اسی طرح کروں گا"۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

وفات

اس واقعہ سے پیکرِ ظلم اور کعبۃ اللہ پر سنگباری کرنے والا شقی القلب حجاج، ابن عمر رضؓ سے دل ہی دل میں برافروختہ ہو گیا۔ مگر ظاہراً اُن کو نقصان پہنچا نہ سکتا تھا۔ چنانچہ ڈپلومیسی سے اس بدبخت نے ایک آدمی کو تیار کیا اور زہر بجھا تیر عین اُس وقت اس ظالم نے آپ کے پاؤں کے آخری حصہ میں مارا جب آپ طوافِ بیت اللہ میں مصروف تھے۔ چنانچہ اسی تیر کے زہر سے آپ اس دُنیائے فانی سے ۷۳ھ میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

اسلامِ ابن عمر رضی اللہ عنہ

آپ بعثتِ نبوی کے تھوڑا عرصہ بعد ہی اپنے والد ماجد کے اسلام لانے پر ہی اسلام لائے۔ اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی۔ پھر آپ نے اپنے والدِ ماجد سے پہلے مدینہ طیبہ کو رسول اللہ کے حکم پر ہجرت کی۔

جنگِ احد میں دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ کرنے کی آپ کی بڑی خواہش تھی مگر کم سنی کے باعث رسول اللہ نے آپ کو جنگِ اُحد میں شمولیت سے منع فرمایا تھا۔

غزوۂ احد کے بعد متعدد غزوات میں رسول اللہ کی معیت میں دادِ شجاعت دی اور متعدد کافروں کو تہِ تیغ کیا۔ جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، فتح افریقہ، فتح مصر و فارس اور بصرہ و مدائن میں شمولیت کی۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال

- تم گناہ کرنا چاہتے ہو تو وہ جگہ تلاش کرو جہاں خدا موجود نہ ہو۔
- دوسروں کی عیب جوئی سے پہلے اپنے عیوب پر نگاہ ڈالو۔
- عبادت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو تنہائی ڈھونڈو۔ دوستوں اور واقف کاروں سے علیحدگی

اختیار کرو۔ مگر یہ اُس وقت جب کہ روزی تلاش کر لو اور اہل وعیال کو میٹھی نیند سو لینے دو۔

- سب سے آسان نیکی خندہ جبینی اور شیریں کلامی ہے۔
- جس طرح میٹھا شربت پی جاتے ہو، غصہ بھی اسی طرح پی جایا کرو۔
- علم تلاش کرو چاہے وہ دشمن کے پاس ہو۔
- اخلاق خراب ہیں تو ایمان بھی خراب ہوگا۔
- میں پہلے خود حدیث پر عمل کرتا ہوں اور پھر لوگوں کو حدیث سناتا ہوں۔

ان ہی ہستیوں کے متعلق مفکر اسلام علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

الٰہی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی

مراجع :- (مآخذ الکتب)

عبداللہ بن عمرؓ — سلام اللہ صدیقی۔

السنۃ ومکانتہا — ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی۔

علوم الحدیث — صبحی صالح

تذکرۃ الحفاظ — علامہ ذہبی

کلیاتِ اقبال — علامہ اقبال

بخاری شریف — امام بخاری

رسائل و مسائل

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۳ کی تشریح

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سوال :- سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۳ - اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ - کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے حاشیہ ۲۶۶ تحریر فرمایا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے اس خروج کی طرف اشارہ ہے جس کے بعد انہوں نے فلسطین میں جہاد لڑنے سے انکار کر دیا - اللہ تعالیٰ نے ان کو صحرائے سینا میں نظر بند کر دیا - ان کے مرنے کے بعد اُن کی نئی نسل جوان ہوئی انہوں نے حضرت یوشع کی قیادت میں فلسطین کو فتح کیا - یہ واقعہ تو اپنی جگہ صحیح ہے لیکن آیت زیرِ بحث کا انطباق اس واقعہ پر نہیں ہو سکتا - کیونکہ اس آیت میں خوفِ موت کو علتِ خروج قرار دیا ہے - لیکن مصر سے بنی اسرائیل کی خروج کی علت خوفِ موت نہ تھی بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم تھا - وَاِذْ اَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ - دوسری بات یہ کہ آیت زیرِ بحث میں خروج کو قابلِ مذمت قرار دیا گیا ہے - لیکن مصر سے خروج قابلِ مذمت نہ تھا - بلکہ ہجرت تھی - تیسری بات یہ کہ :- فقال لهم الله موتوا ثم احياهم کے الفاظ کا متبادر مفہوم یہی ہے کہ جن لوگوں پر موت طاری کر دی گئی تھی انہی کو پھر زندہ کر دیا گیا - میں نے تفاسیر کا مطالعہ کیا، کہیں بھی آپ والی بات نہیں ملی - بلکہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی طرف اشارہ بتاتے ہیں - اور لکھتے ہیں کہ طاعون کے خوف سے بھاگتے ہوئے نکلے - راستہ میں اُن کو موت دی گئی - پھر انہی کو زندہ اٹھایا گیا - مہربانی فرما کر اس اشکال کو حل فرمائیں -

جواب:۔ سورہ بقرہ کی جس آیت کی تشریح پر آپ نے اشکال کا ذکر کیا ہے اس کے الفاظ بجائے خود اسی تشریح کے مقتضی ہیں۔ اور مزید برآں آگے کا سلسلۂ کلام بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ اور حَذَرَ الْمَوْتِ کے درمیان وَهُمْ أُلُوْفٌ پر غور فرمائیے۔ اگر گھروں سے نکلنے کا سبب طاعون یا کسی وبا سے مرجانے کا خوف ہوتا تو یہاں وَهُمْ أُلُوْفٌ کہنا بے معنی ہوتا۔ کیونکہ ایسی موت کا خوف دس بیس آدمیوں کو بھی ہو سکتا ہے اور سینکڑوں آدمیوں کو بھی۔ اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جس پر عبرت دلانے کے لیے ان لوگوں کو ہلاک کر دینے کا ذکر کوئی اہمیت رکھتا ہو۔ وَهُمْ أُلُوْفٌ کے الفاظ اس جملے میں صاف طور پر یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے خوف سے بھاگ نکلے۔ أُلُوْفٌ کا لفظ دس ہزار سے زیادہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے بہت زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود ان کا بھاگ نکلنا اسی صورت میں قابل مذمت ہو سکتا ہے جب کہ وہ کسی دشمن کے مقابلے سے اس بزدلی کی بنا پر بھاگے ہوں کہ جان انہیں بڑی پیاری تھی اور موت سے وہ ڈرتے تھے۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ لازمی طور پر یہی معنی نہیں رکھتا کہ جن لوگوں کے حق میں ہلاکت کا فیصلہ کیا گیا ہو، وہی پھر زندہ کر دیے گئے ہوں۔ ایک قوم کے معاملے میں جب یہ بات کہی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے خوفِ موت رکھنے والوں کو اسی موت کا مزہ چکھا دیا جائے جس سے وہ ڈرتے تھے۔ اور اسی قوم کے دوسرے افراد کو وہ زندگی بخش دی جائے جس سے وہ موت سے بے خوف ہو کر غنیم کا مقابلہ کریں۔ آگے کی آیت وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، الآیۃ۔ اس مقصودِ کلام کو واضح کر دیتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ واقعہ سنا کر راہ خدا میں لڑنے کی ہمت دلائی جائے۔ اس سلسلۂ کلام میں طاعون یا کسی وبا سے مرنے کے خوف کا آخر کیا محل ہے۔

رہی یہ بات کہ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کا اصل سبب خوفِ موت نہیں، بلکہ حکمِ ہجرت تھا، لہٰذا اس کے بارے میں یہ امر غور طلب ہے کہ مصر میں کثیر التعداد ہونے کے باوجود ان کو لڑ کر اپنی جان و مال بچانے کا حکم دینے کے بجائے ہجرت کا حکم کیوں دیا گیا؟ اس کی وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ وہ فرعون اور آلِ فرعون سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ بدترین مظالم سہ رہے تھے اور اُف نہ کرتے تھے، بلکہ حضرت موسیٰ سے وہ اُلٹی شکایتیں کر رہے تھے کہ آپ کے آنے سے تو ہم اور مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔

تفہیم القرآن میں لفظ "تسویل" کے مختلف معانی

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سوال: تفہیم القرآن کے دو مقامات پیش نظر ہیں:

۱۔ سورۂ یوسف کی دو آیتیں یعنی ۱۸ اور ۸۳: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ۔

آنجناب نے دونوں مقامات پہ یہ ترجمہ کیا ہے:

"یہ سن کر ان کے باپ نے کہا: بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔"

باپ نے یہ داستان سن کر کہا: "دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا ہے۔ اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔"

۲۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۶: وکذالک سولت لی نفسی:

اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا ہے۔"

یہاں بھی وہی "سولت" ہے لیکن ترجمہ مختلف ہے۔ حالانکہ دونوں جگہ اس فعل کا فاعل "النفس" یا اس کا واحد "نفس" ہے۔ تسویل تسہیل کے معنوں میں تو نہیں آتا۔ آنجناب کی تصریح کا خواستگار اور منتظر ہوں۔

جواب: سورۂ یوسف کی آیات ۱۸ اور ۸۳ میں سَوَّلَت کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہی علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

سَوَّلَتْ (سھلت من السَّوَلِ وھو الاسترخاء) لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (عظیماً ارتکبتموہ من یوسف وھَوَّنَتْہُ فِی اعینکم)

(سَوَّلَت کے معنی سہلت کے ہیں یعنی آسان کر دیا (اس کا مادہ سَوَل ہے، یعنی نرم ہو جانا،

جھک جانا)، تمہارے نفوس نے تمہارے لیے اس بھاری کام کو جس کا ارتکاب تم نے یوسف کے معاملے میں کیا اور تمہاری نگاہوں میں اُسے معمولی چیز بنا دیا]۔

بخلاف اس کے سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۶ میں سَوَّلَت کا وہ مفہوم موقع و محل سے مناسبت نہیں رکھتا، جو سورۂ یوسف کے ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ یہاں سامری اپنی صفائی پیش کر رہا ہے۔ اس لیے یہاں میں نے تسویل کو تحسین کے معنی میں لیا ہے۔ اور اس کی گنجائش بھی لغت میں موجود ہے۔

التسویل، تحسین الشئ وتزیینہ الی الانسان لیفعلہ او یقولہ

(تسویل کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کو انسان کے لیے خوشنما اور مزین بنا دیا جائے تاکہ وہ اسے کرے یا کہے)

گویا سامری یہ کہہ رہا ہے کہ "میرے نفس نے ہی کچھ میرے سامنے ایک اچھے کام کی حیثیت سے پیش کیا"

اسی مفہوم کو میں نے سجھانے کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ اردو زبان میں ایسے مواقع پر سجھانا قریب قریب اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں تسویل کا لفظ عربی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے، "یہی مصلحت دی مجھ کو میرے جی نے"۔

امام راغب نے بھی اپنی مفردات القرآن میں تسویل کے معنی تزیین و تحسین بیان کیے ہیں وہ لکھتے ہیں:

التسویل، تزیین النفس لما تحرص علیہ وتصویر القبیح منہ بصورۃ الحسن۔

(تسویل سے مراد یہ ہے کہ انسان کا نفس اپنی انگیخت کو اس کے لیے مزین کر دے اور برائی کو اس کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کرے)

قاموس میں ہے: سوّلت لہ نفسہ کذا: زینت والاسول من فی اسفلہ استرخاء۔

لین LANE نے اپنی لغت مدّ القاموس میں سوّل کے معنی درج کیے ہیں:

MADE IT APPEAR EASY TO HIM

(اس بات کو اس کے لیے آسان بنا دیا)

مطبوعات

نوٹ: یہ حقیقت تو واضح ہے کہ ترجمان القرآن کے صفحات میں مطبوعات کے لیے بہت مشکل سے دو تین صفحات نکالے جا سکتے ہیں۔ کتب تبصرہ کچھ زیادہ ہی موصول ہوتی ہیں اور مختلف اصحاب اپنی اپنی کتابوں پر جلد تبصرہ کرنے کے لیے خط لکھتے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ ایسے تقاضوں کو تیزی سے پورا کیا جا سکے۔ متعلقہ اصحاب (مؤلفین اور ناشرین) سے معذرت! (ف۔ ص)

صحیح مسلم
از امام مسلم بن الحجاج قشیری، نیشاپوری
اُردو ترجمہ: پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم
سابق مدیر ترجمان القرآن
ناشر: رحمان پبلشنگ کمپنی۔ اچھرہ، لاہور
ضخامت و معیار: بڑے سائز کے ۶۲۳ صفحات
ٹائیٹل دبیز آرٹ پیپر۔ سفید کاغذ۔
کتابت و طباعت متوسط
قیمت: حصہ اول (کتاب الایمان) ۱۷/- روپے

ترجمان القرآن کے سابق ایڈیٹر برادرم عبدالحمید صدیقی نے ملت کے لیے جو گراں بہا علمی میراث چھوڑی ہے۔ اس میں سے ایک حدیث کے بلند پایہ مجموعے "صحیح مسلم" کا اُردو ترجمہ ہے۔

مسلمانوں کے لیے علمِ دین کی ضرورت ہر قسم کے حالات میں برقرار رہتی ہے۔ مگر خاص طور پر آج جب کہ پاکستان نے اسلامی نظام کی طرف قدم بڑھا دیے ہیں، یہ ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ اُردو زبان میں قرآن پر تو تراجم و تفاسیر کا ذخیرہ اب خاصا وزنی ہے، مگر حدیث کے دائرے میں جتنا کچھ کام ہوا ہے اُس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انفرادی زندگی کے علاوہ، تعلیمی، معاشی، سیاسی اور دیگر بڑے بڑے اجتماعی

معاملات میں سنّتِ نبوی کے ریکارڈ سے روشنی اخذ کیے بغیر ہم ایک قدم نہیں چل سکتے - اوّلین اہمیت صحاح ستّہ سے استفادہ کو حاصل ہے، اور ان میں سے بھی بخاری و مسلم کے دو مجموعے بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں - صحاح ستّہ میں سے اگرچہ متعدد کتابوں کے تراجم ہو چکے ہیں - لیکن ان تراجم کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ناشرین نے کاروباری بنیادوں پر کرائے ہیں - اور ان کی اشاعت میں بھی اغلاط بہت ہیں - بخلاف اس کے صدیقی مرحوم نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ ان کے دلی تقاضوں کا نتیجہ ہے - پھر اس کی اشاعت کے لیے بھی الرحمٰن پبلشنگ کمپنی نے بہتر معیار پیش کیا ہے -

عرضِ ناشرین کے بعد بہت مفید مقدمہ دیا گیا ہے - ہوگا تو یہ مترجم ہی کے قلم سے، مگر اس کے سامنے نام نہیں لکھا گیا -

ترتیب یوں ہے کہ صفحے کے بالائی حصے میں (اوسطاً ایک تہائی) عربی متن ہے، نیچے ترجمہ اس سے نیچے تشریحی اشارات - صفحات کے اس آخری حصے میں بعض لفظوں اور محاورات کی وضاحت، اصطلاحات کی تفہیم، رجال کا تعارف، مقامات اور دیگر اعلام کی معلومات یا ارشاداتِ نبوت کے واقعاتی پس منظر وغیرہ درج ہیں -

ایک کمی یہ محسوس ہوئی کہ عربی متن اگرچہ متوسط اچھی کتابت سے دیا گیا ہے، مگر وہ اس حسن و خوبی تک پہنچتا جو جدید عربی ٹائپ میں پائی جاتی ہے - اسی طرح کتاب کو ۴۸ حصوں میں ماہانہ شائع کرنے کا پروگرام اگرچہ کم آمدنی رکھنے والے قارئین کے لیے خریداری کو سہل بنانے کا موجب ہو سکتا ہے، مگر ایک اعلیٰ درجے کی کتاب کا اتنے بہت سے اجزاء میں بٹ کر دو سال کے عرصے میں اشاعت پذیر ہونا کوئی بہتر صورت نہیں ہے - کاش کہ ناشرین اتنے سرمائے کا انتظام کر سکتے کہ صحیح مسلم دو جلدوں میں آ جاتی - یا حد سے حد ۶ جلدوں میں - موجودہ جلد کی ضخامت کم ہونے کی وجہ سے وہ جلد بندی کے مصارف کی متحمل نہیں ہے، اور ٹائیٹل کی موجودہ شکل اتنی عظیم کتاب کے وقار کے متناسب نہیں ہے -

علاوہ ازیں ٹائیٹل کی ڈیزائننگ کو بھی کتاب کی نوعیت کے مطابق سادہ و وقیع ہونا چاہیے تھا -

آخر میں مجموعی تاثر یہی ہے کہ اردو میں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے احادیث کے تراجم میں برادرم عبدالمجید صدیقی مرحوم کے ترجمے کو ایک خاص مقام حاصل ہوگا اور اسے شائع کرنے پر ناشرین مبارکباد کے مستحق ہیں -

---

ماہنامہ "فکر و نظر" اسلام آباد
(اشاعت ربیع الاول ۱۳۹۹ھ)
مدیر: شرف الدین اصلاحی
ضخامت: ۱۲۰ صفحات
چندہ سالانہ: -/۱۵ روپے
فی شمارہ ۱/۵۰ روپیہ

"ادارۂ تحقیقات اسلامی" (اسلام آباد) کا رسالہ پہلے سے ارباب فکر و نظر کے حلقوں میں متعارف ہے۔ پیش نظر شمارہ تذکرۂ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہونے کی وجہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور غالباً ضخامت بھی زیادہ ہے۔ اس کے نگران ڈاکٹر عبدالواحد، ہالے پوتا، ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی ہیں۔

اداریہ (بہ عنوان نظرات) میں مختصراً مقام نبوت کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی مدعا یہ ہے کہ اگرچہ انسانی فطرت میں خیر و شر کے فہم اور شعور کی صلاحیت رکھی گئی ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ "انسان مجرد اپنی فطرت کی بدولت نبی کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کے بغیر صراط مستقیم کو پا سکتا ہے۔"

ارشاد شاکر اعوان صاحب کے مضمون "محامد محمدؐ ما قبل بعثت" میں بہت سی ایسی پیشگوئیوں کا تحقیقی بیان ہے جو حضورؐ کے ظہور سے پہلے اہل کتاب اور عربوں میں دائر و سائر رہیں۔ مضمون کے آخر میں فہرست مآخذ کا ہونا افادیت میں اضافہ کا باعث ہے۔

دوسرا اہم مضمون حکیم محمد یحییٰ کے قلم سے "عربی نعت کا ارتقاء" ہے، جس میں تیس۳۰ شعرا اہل عرب کے علاوہ اس میں برصغیر پاک و ہند کے عربی نعت گوؤں کا ذکر بھی ہے۔ ہر ایک کے ساتھ مثالیں دی گئی ہیں۔ مگر رسالے کے ظرف کی مجبوری سے بہت کم اشعار مضمون میں لیے گئے ہیں۔ مثلاً جناب ابوطالب کے طویل رجز یہ قصیدے میں سے واحد مشہور ترین شعر پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اتنی زوردار چیز ہے کہ اس میں سے کم سے کم سات آٹھ اشعار لازماً سامنے آنے چاہییں تھے (حضرت حسان کے دیوان میں سے بھی ایک نعتیہ قصیدے (اور ایک مرثیے) کا مختصراً اقتباس ہے۔ یہی صورت کعب ابن زہیر کی ہے — عربی زبان اور اس وقت کے معیار شعر کے لحاظ سے انتہائی زوردار قصیدہ کعب نے لکھا تھا۔ اس کا بھی تعارف پوری طرح نہیں ہو سکا۔ پھر شعراء کے فنی مقام اور ان کی نگارشات کے متعلق اظہار رائے بھی نہیں ہو سکا۔ اس کے لیے زیادہ صفحات درکار تھے۔ اقبال اور حب رسولؐ (کرم حیدری) نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے خال و خط (حافظ محمد یونس) حضرت رسالتمآب کے مکاتیب (ڈاکٹر محمد ریاض) اچھے مضامین ہیں۔ مولانا فراہی کے متعلق مضمون کا تعلق سیرت نبوی سے نہیں، اگرچہ مفید چیز ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت پسندیدہ ہے۔

یتیم پوتے کا حقِ وراثت

مؤلف: سید غلام احمد رضوی

ناشر: مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

ضخامت: ۱۲۰ صفحات

قیمت مجلد ۵/ روپے

منکرین حدیث ملت کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مختلف اشتقلے اٹھاتے رہے ہیں۔ کبھی نماز کے متعلق، کبھی حج اور قربانی کے متعلق، کبھی زکوٰۃ کے متعلق، کبھی ذبح کے متعلق (ایک صاحب نے بروئے قرآن مچھلی کو ذبح کرنا لازم قرار دیا تھا) پھر اجتماعی اُمور کے متعلق، مثلاً خدا اور رسولؐ سے مراد وقت کا حاکم یعنی "مرکزِ ملت" ہے وغیرہ۔ اسی گرما گرمی میں انہوں نے یتیم پوتے کی وراثت کی بحث اٹھائی جو خاصے حلقوں میں مغالطہ انگیزی کا باعث ہوئی۔ ایسے جدت مآب حلقوں کے زیر اثر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے سامنے ۱۹۵۳ء میں چوہدری محمد اقبال چیمہ نے ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا مقصد یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو دادا کی میراث میں سے چچاؤں اور تایوں کے برابر حصہ دلوانا تھا۔ اس مسودۂ قانون کے خلاف متعدد مقالات شائع ہوئے۔ ازانجملہ ایک مقالہ مولانا مودودی کے معاونِ خصوصی ملک غلام علی صاحب کے قلم سے سامنے آیا۔ ایک راقم الحروف نے لکھا، اور ایک سید غلام احمد رضوی ایڈووکیٹ گوجرانوالہ نے تحریر کیا۔

رضوی صاحب نے پہلا مقالہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں شائع کرایا۔ پھر ان کا ایک مضمون مارچ ۱۹۵۴ء میں چٹان کے صفحات پر شائع ہوا۔ پھر ایک ضمنی بحث پر انہوں نے الگ استدراک لکھا۔ انہی مضامین کا مجموعہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

اس کتاب میں مثالیں دیتے ہوئے زید، بکر، عمر، کے ناموں کا جو استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنے اندر ایک غلط پہلو رکھتا ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

واضح رہے کہ ۱۹۵۳ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی نے تو معاملہ گول مول کر دیا۔ مگر دَورِ ایوبی میں جو عائلی قانون ۱۹۶۱ء جاری کیا گیا۔ اس میں نظامِ وراثت میں وہی تبدیلی کی گئی ہے جس کے خلاف سید غلام احمد رضوی اور دوسرے اصحاب نے آواز اٹھائی تھی۔ اب جبکہ سنجیدگی سے اسلامی قوانین و احکام کا اجراء پیش نظر ہے۔ نہ صرف وراثت کے موضوع پر، بلکہ دوسرے مسائل پر بھی گہرے تفکر سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ یہ پمفلٹ وجہ تحریک ہوگا۔

(بقیہ اشارات)

دوسرے لفظوں میں اسی بات کو قرآنی اصطلاح میں یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام کا مطلوب انسان کو حالتِ خوف سے نکال کر حالتِ امن تک پہنچانا ہے۔

حالتِ امن کو آج کل کی زبان میں آپ احساسِ تحفظ (SENSE OF SECURITY) کہہ سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ بہت سے پہلوؤں سے احساسِ تحفظ سے محروم ہے۔ نتیجہ وہی حالتِ خوف اور عالمِ اضطراب ہے۔ اور اس کی وجہ سے لوگوں کا معیشۃً ضنکاً (تنگی کی زندگی) میں مبتلا ہونا ہے۔

استحصال اور تنگدستی کا خوف، انتظامیہ اور بیوروکریسی کی کج شعاریوں کا خوف، حصولِ حقوق میں رشوت اور سفارش کے حائل ہونے کا خوف، جرائم کا خوف، مجرمین کے قانون کی زد سے بچ نکلنے اور ہیر پھیر سے نظامِ انصاف پر اثر انداز ہونے کا خوف، صوبائی، نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے ملک کے کمزور ہونے کا خوف، غیر ملکی سازشوں کے اثر انداز ہونے کا خوف۔ انتخابات سے غیر تعمیری نتائج برآمد ہونے کا خوف۔ اس طرح کے بے شمار خوف ہیں جن کے بوجھ تلے عوام دبے ہوئے ہیں۔

درپیش مہم اور تہہ در تہہ خوف کے بوجھ رکھنے والی زندگی سے عوام کو کیسے نکالا جائے؟ حکومت اور معاشرہ اس سوال کا صحیح جواب اگر دے سکیں تو اسلام کا مقصود حاصل ہو گیا۔

تصحیح

پچھلے اشارات میں سہواً یہ بات درج ہو گئی کہ پندرھویں صدی شروع ہونے میں نو ماہ باقی ہیں حالانکہ ایک سال نو ماہ لکھا جانا چاہیے تھا، یا ۲۱ ماہ۔

قارئین سے معذرت کرتے ہوئے گذارش ہے کہ تصحیح کرلیں۔

(ادارہ)

خوشخبری

ادارہ ہٰذا نے عوام کی بھرپور مانگ اور اسلامی لٹریچر کو عام آدمی تک پہنچانے کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی مدظلہ کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرت سرورِ عالم" کے دوسرے ایڈیشن کی قیمت میں حیرت انگیز کمی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب "سیرت سرورِ عالم" قسم دوم کی دونوں جلدوں کی قیمت علاوہ ڈاک ۸۰/۰ روپے ہوگی۔ عام خریداروں کو اس پر ۲۰ فیصد رعایت بھی دی جائے گی۔ چنانچہ ادارہ ہٰذا سے ۶۴/۰ روپے میں مکمل سیٹ (جلد اول و دوم) دُوسرا ایڈیشن تقریباً دو ماہ تک دستیاب ہوگا۔ بذریعہ ڈاک قیمت ۶۸/۰ روپے ہوگی۔ پیشگی بکنگ کی جا رہی ہے۔ جس ترتیب سے پیشگی رقوم وصول ہونگی اُسی ترتیب سے ترسیل ہوگی ــ لہٰذا تمام خریدار حضرات جلد از جلد پیشگی رقوم بھجوا کر مشکور فرمائیں۔ خریدار حضرات اپنا پتہ مکمل اور صاف لکھیں۔

منجانب:-

ناظم ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ لاہور